Registered No. L. 4186

محرم ۱۳۵۸ھ — جلد ۱۴ - عدد ۱

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ملتان روڈ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	۱۰ ے	۲۵ ے	۴۵ ے	[illegible]
نصف صفحہ	۶ ے	۱۵ ے	۲۵ ے	۴۵ ے
ربع صفحہ	۴ ے	۱۰ ے	۱۷ ے	۲۵ ے

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرستِ مضامین

ماہ محرّم ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۹ء جلد ۱۴ - عدد ۱

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہوکر

دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وسائر النبیین والذین اتبعوھم باحسان الیٰ یوم الدین۔ "حمد خدا کے لیے ہے جو پروردگار ہے سارے جہان کا۔ اور صلوٰۃ وسلام ہے سیدنا محمدؐ اور تمام انبیاء پر اور ان سب لوگوں پر جو روز جزا تک سچائی کے ساتھ ان کی پیروی کریں"۔

اس کے بعد میں اعلان کرتا ہوں کہ ہدایت صرف وہ ہے جو خدا کی طرف سے اس کے نبی لائے، اور اس کے سوا سب گمراہی ہے۔ پیروی کے قابل صرف نبی کا طریقہ ہے اور اس کے سوا ہر دوسرے طریقہ کی پیروی باطل ہے نور صرف اللہ کی کتاب میں ہے اور اس کو چھوڑنے والے کے لیے تاریکیوں میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں۔ بندگی، اطاعت، محبت سب کچھ خدائے واحد کے لیے ہے، اور ہر وہ اطاعت و محبت فاسد ہے جو لوجہ اللہ نہ ہو۔ فلاح و کامرانی صرف خدا کے قانون کی حکومت میں ہے، اور اس کے سوا ہر دوسرے قانون کی حکومت انسان کے لیے غارت گر و تباہ کن ہے۔ خدا کا قانون بالکلیہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر معاملہ میں مسلمان کا رہنما ہے اور وہ شخص گمراہی میں مبتلا ہے جو بعض معاملات کو اس قانون کا تابع اور بعض کو اس سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔

اس اشاعت سے "ترجمان القرآن" کی زندگی کا ساتواں سال شروع ہو رہا ہے، اور میں اس سال کا آغاز بھی اسی مالک علم و عالمیان کی حمد و ثنا کے ساتھ کرتا ہوں جس کے فضل و احسان سے مجھ کو اب تک اپنی یہ ناچیز خدمت جاری رکھنے کی توفیق نصیب ہوتی رہی ہے۔ اللہ اکبر! اس بخشش کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ ایک بے وسیلہ اور بے یار و مددگار آدمی دینی بے حسی، سیاسی و مذہبی جتھے بندی اور اخلاقی انحطاط کے اس دور میں، اس قسم کا ایک کڑوا اور بے لاگ رسالہ

پورے چھ برس نکالتا رہے؟ اور اس دوران میں اس کو کبھی کسی مخلوق کا منت کش نہ ہونا پڑے۔ انا عند ظن عبدی بی کسی کے لیے تو ادعائی چیز ہوگی، مگر میرے لیے یہ برسوں کی آزمائی ہوئی، پرکھی اور جانچی ہوئی حقیقت ہے۔ میں تو اس کو یوں جانتا ہوں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کو جانتا ہے۔ جیسا گمان میں نے اول روز سے اپنے رب کے ساتھ قائم کیا تھا، قربان اس ذاتِ پاک کے کہ ویسا ہی اس کو پایا اور برابر پائے جا رہا ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس نے مجھے اپنی خوشنودی کے سوا کسی کی خوشنودی کا طالب نہ بننے دیا، اپنے غضب کے سوا کسی کے غضب سے خوفزدہ نہ ہونے دیا، اور اپنے در کے سوا کسی در کی طرف نظرِ احتیاج سے دیکھنے تک کا موقع نہ آنے دیا۔ اس نے پوچھا تھا الیس اللہ بکاف عبدہ؟ "کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟" میں نے سچے دل سے اقرار کیا "ہاں تو ہی میرے لیے کافی ہے" اور وہ حقیقت میں میرے لیے کافی ہوگیا، ایسا کافی ہوا کہ میرے اقرار کی لاج رکھنا بھی اس نے اپنے ہی ذمہ لے لیا۔ اس کی کفایت اور کمال درجہ کی کفایت کو حیدرآباد کی گوشہ نشینی میں بھی دیکھ چکا ہوں اور پنجاب کی اس خانہ بدوشانہ زندگی میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پھر کیوں نہ میرا دل اس کے لیے شکر و احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جائے؟ اور کیوں میں اپنے رب سے بدگمانی کروں کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی خوشنودی کا طالب بن جاؤں؟

اس رسالہ کی ترقی کے لیے بہت سی تمنائیں میرے دل میں ہیں۔ جس طرز پر یہ نکل رہا ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک زبردست انقلابی طاقت بن جائے۔ خیالات کا رُخ جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دے۔ افکار کی تطہیر، تنویر اور تعمیر خالص اسلام کے اصولوں پر کرے۔ اسلام جو ایک جامد یادگارِ قدیم بنا کر رکھ دیا گیا ہے اس کو یہ ایک نامی، متحرک اور محرک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کرے۔ اعلیٰ درجہ کی تنقید کے ساتھ دنیا کی ایک ایک گمراہی کا استیصال کرے اور گہری تحقیق کے ساتھ زندگی کے ایک ایک مسئلہ کو اصولِ اسلام کے مطابق حل کرے۔ یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں۔ مگر بدقسمتی سے اکیلا اور نہتا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں، اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر وہ کمیاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ ان کی دھن میری دھن سے الگ۔ ان کی گرویدگیوں کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جدا۔ ان کی روح میری روح سے ناآشنا۔ ان کے کان میری زبان سے بیگانہ

یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے سب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے پر میں مجبور ہوں۔ میں اس کے اجزا میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں اور اسکی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کلّی و ہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا۔ ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس تبخانے کے کسی نہ کسی بُت سے لَو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بُتوں کو توڑ دو مگر میرے بُت کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جُزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کُلّی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کمیاب ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانہ پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا۔

بعض اوقات اس صورت حال کو دیکھ کر میری بشری کمزوریاں میرا دل توڑنے لگتی ہیں۔ مگر جب وہ آواز میرے کانوں میں آتی ہے جس سے دنیا کے سب سے بڑے مسلمان نے اپنے غار کے رفیق کی ڈھارس بندھائی تھی تو میرے دل کی بجھتی ہوئی آگ پھر بھڑک اُٹھتی ہے: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

اس رسالہ کی زندگی کا مقصد ابتدا سے حق کا اظہار و اعلان رہا ہے جس طرح حق کسی کی ہوائے نفس کا پابند نہیں اسی طرح یہ رسالہ بھی کسی کی ہوائے نفس کا پابند نہیں، حتیٰ کہ خود رسالہ کے ایڈیٹر کو بھی اپنی شخصی دلچسپیوں اور اپنے مفاد کے لیے اس کے صفحات استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی بنا پر یہ رسالہ کبھی کسی شخص یا جماعت کا نقیب نہیں بنا، اور نہ اس نے کسی شخص یا جماعت کی مخالفت کو مقصود بالذات قرار دیا۔ حق کسی کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے کہ جدھر جدھر وہ گردش کرے، حق بھی اس کے ساتھ چکّر لگاتا رہے۔ لہٰذا کسی شخص یا گروہ کے ساتھ یہ دائمی معاہدہ کر لینا سراسر باطل ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرے گا اس کی تائید و حمایت کی جائے گی۔ اور اسی طرح کسی کی مخالفت کو بھی مسلک بنا لینا حق پرستی کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارے پاس صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے لیے کتاب و سُنّت کی روشنی اور خدا کی بخشی ہوئی عقل و بصیرت موجود ہے۔ ہم کو اشخاص اور جماعتوں کے حلقۂ غلامی سے آزاد ہو کر اس روشنی میں اس

بصیرت سے کام لے کر دیکھنا چاہیے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ پھر اس طریقہ سے جو کچھ صحیح معلوم ہو اس کی حمایت کرنی چاہیئے اور جو کچھ غلط معلوم ہو اس کی مخالفت کرنی چاہیئے قطع نظر اس کے کہ اس کا فائدہ کسے حاصل ہوتا ہے اور اس کی ضرب کس پر پڑتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ پالیسی جو رسالہ اختیار کرے گا وہ ہمیشہ کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ آج وہ جن کے خیالات و اعمال کو صحیح سمجھ کر اس کی تائید کرتا ہے وہ اس پر خوش ہوتا ہے' اور کل اگر اسی کے کسی دوسرے خیال یا عمل کو وہ غلط سمجھ کر اس کی مخالفت کرے گا تو وہ اس سے ناراض ہو جائے گا۔ یہی اُتار چڑھاؤ اس رسالہ کی زندگی میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور شائد ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ پچھلی ۱۷ اشاعتوں میں سے شائد ہی کوئی اشاعت ایسی گذری ہوگی جس پر کسی نہ کسی شخص یا جماعت کو اس سے شکایت پیدا نہ ہوئی ہو۔

یہ تو وہ صورتِ حال ہے جو ابتدا سے قائم رہی ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ گذشتہ سال کی اشاعتوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بعض دوستوں کی طرف سے ایسی سخت شکایتیں ہوئی ہیں کہ اس سے پہلے کبھی اتنی شکایتوں کی بھرمار مجھ پر نہ ہوئی تھی۔ چونکہ میں اپنے آپ کو غلطی سے پاک نہیں سمجھتا اس لیے میں نے ان تمام تحریروں کو' جن کی شکایت کی گئی ہے' ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھا' اور ان کا موازنہ اپنی اُن سابق تحریروں سے بھی کیا جن پر میرے یہی دوست کبھی تحسین و آفرین کے پھول برسایا کرتے تھے۔ اس موازنہ میں مجھ کو دونوں قسم کی تحریروں کے درمیان کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔ جس قسم کے الفاظ' اسلوب بیان اور طرزِ استدلال سے کام لینے کا میں ہمیشہ خوگر رہا ہوں اسی سے میں نے ان تحریروں میں بھی کام لیا ہے۔ اپنے علم و فہم کے مطابق کسی چیز کو غلط پا کر اس کی تردید جتنے زور سے میں پہلے کرتا تھا اتنے ہی زور سے ان تحریروں میں بھی کی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جس چیز کو پہلے "زورِ بیان" اور "طاقتورِ استدلال" کہا جاتا تھا' اسی کو اب تلخی و درشتی سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ جو زبان پہلے داد کی مستحق تھی وہی اب شکایت کی سزاوار ہوگئی؟ اس سوال پر میں نے جتنا غور کیا' میری سمجھ میں اس کے سوا کوئی اور وجہ نہ آئی کہ پہلے جن تحریروں کی داد دی گئی تھی ان کی زد میرے ان دوستوں کی مخالف جماعت پر پڑتی تھی اس لیے ان کو اس میں تلخی محسوس نہ ہوئی بلکہ اس کے الفاظ

اور اسلوبِ بیان کو یہ متانت اور قوت استدلال سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ مگر اب جن تحریروں پر شکایت فرمائی جارہی ہے ان کی زد خود ان حضرات اور ان کی عقیدت و نیاز مندی کے مرکزوں پر پڑتی ہے اس لیے ان میں تلخی، درشتی، یادہ گوئی (بزبان شائستہ "طول کلامی") اور سارے ہی عیوب محسوس کیے جارہے ہیں۔ غالباً میرے ان دوستوں کا مطالبہ یہ ہے کہ جن خیالات اور تحریکوں کو ہم بھی تمہاری طرح غلط سمجھتے ہوں ان کے مقابلہ میں تو تم کو استدلال کی پوری قوت صرف کر دینے کا حق ہے، مگر جن خیالات اور تحریکوں کو ہم صحیح سمجھیں اور تم غلط سمجھو ان کے مقابلہ میں تمہیں کمزور استدلال اور پھُس پھُسی زبان سے کام لینا چاہیے تاکہ ہم آسانی کے ساتھ اس کا رد کر سکیں اور عامۃ الناس کے ذہن پر جو اثر تم ڈالنا چاہتے ہو وہ مترتب نہ ہو سکے۔

ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ مطالبہ کتنا معقول ہے اور کہاں تک اس کی پروا کی جانی چاہیے۔ جن لوگوں نے اپنے دامن پارٹیوں کے ساتھ باندھ رکھے ہیں، جن کی عقیدتوں کی مرکز چند خاص شخصیتیں ہیں، اور جن کی دلچسپیوں کے دائرے محدود ہیں، وہ ایک آزاد روح اور بے لاگ ضمیر والے انسان کی پوزیشن نہیں سمجھ سکتے۔ میرے دل میں شخصیت پرستی اور پارٹی فیلنگ کے بُت بیٹھے ہوئے نہیں ہیں اور نہ میں حق کے سوا کسی سے محبت اور باطل کے سوا کسی سے عداوت رکھتا ہوں، اس لیے مجھ سے یہ بن نہیں آتا کہ کوئی غلطی کرے تو میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ اس کی مخالفت کروں، اور کوئی دوسرا غلطی کرے تو میں زبان پر مہرِ سکوت لگا لوں، یا آواز نکالوں بھی تو وہ اتنی پست ہو کہ گویا حلق میں کچھ پھنس گیا ہے۔

بعض حضرات کو شکایت ہے کہ یہ پرچہ اپنے اصل مسلک اور اعلان کردہ مقصد سے ہٹ کر سیاسیات میں پڑ گیا ہے، اور اس نے اپنی اصلی قدر و قیمت کھو دی ہے۔ آج اس کے متعلق بھی میں کچھ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ "سیاست ہے کیا چیز؟" اجتماعی زندگی کی تنظیم حاکمانہ قوت کے ساتھ کرنے کا نام سیاست ہے۔ جماعتی زندگی کی صورت گری کرنے میں متعدد اسباب کا دخل ہوتا ہے۔ ایک قسم کے اسباب وہ ہیں جو فکری قوتوں کے واسطے سے جماعت پر اثر ڈالتے ہیں۔ دوسری قسم کے اسباب وہ ہیں جو مادی ضروریات کے واسطہ سے اثر انداز ہوتے ہیں

تیسری قسم کے اسباب وہ ہیں جو نفاذِ علم کی جبری طاقت کے بل پر اپنی تاثیر دکھاتے ہیں۔ ان سب اسباب کے درمیان ایک گہرا ربط ہے۔ یہ خود بھی ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں، اور پھر ان سب کے باہمی تعامل سے اجتماعی زندگی کی شکلیں بنتی اور بگڑتی ہیں جس شخص کو اجتماعی فلاح سے دلچسپی نہ ہو اس کے لیے تو اپنے آپ کو ان مختلف دائروں میں سے کسی ایک دائرے میں محدود کر لینا آسان ہے۔ لیکن جس کی دلچسپیوں کا مرکز ہی بنیادی مسئلہ ہو وہ تو یہ دیکھنے پر مجبور ہے کہ ان سب دائروں میں کیا ہو رہا ہے، اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اجتماعی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے یہ عہد کر کے بیٹھ جانا محال ہے کہ وہ صرف اعتقادی یا علمی امور سے بحث کرے گا۔ کیونکہ یہ امور فی نفسہٖ اس کے مقصود نہیں ہیں بلکہ اس کو ان سے دلچسپی اس لیے ہے کہ اجتماعی زندگی کی صورت بنانے اور بگاڑنے میں یہ بھی اثر رکھتے ہیں۔ پھر جب کہ معاشی اور سیاسی امور بھی اس تاثیر میں شریک ہوں تو وہ اُن کی طرف سے آنکھیں بند کیسے کر سکتا ہے؟

اس پرچے کو جاری کرنے سے میرا مقصد چند لوگوں کے لیے دماغی عیاشی کا سامان فراہم کرنا اور اس سے اپنی دنیا بنانا تو ہے نہیں۔ میرے سامنے ایک بلند ترین نصب العین ہے جس کے لیے میں نے اس رسالہ کو واسطہ بنایا ہے اور وہ نصب العین یہ ہے کہ خالص اسلامی اصولوں پر اجتماعی زندگی کی تشکیل ہو۔ اس تشکیل میں جتنے اسباب کارگر ہوں گے میں اُن سب سے بحث کروں گا اور جو جو قوتیں اس میں مزاحم ہوں گی ان سب کے خلاف جنگ کروں گا۔ افکار اور نظریات اور علمی تجربات اُن طاقتوں میں سے صرف ایک طاقت ہیں جو اجتماعی تشکیل کو اسلامی یا غیر اسلامی بنا سکتی ہیں۔ صرف انہی پر بننے اور بگڑنے کا مدار نہیں ہے۔ اگر سیاسی اور معاشی طاقتیں ہمارے نصب العین کے خلاف کام کر رہی ہوں اور وہ زمین پر مسلط ہو جائیں تو اُن کی پشت پر جو افکار و نظریات ہوں گے وہی ساری زمین پر چھا جائیں گے اور اس صورت میں ہمارا قرآنی نکات و لطائف کی شرح و تفسیر کرنا اس کے سوا کوئی معنی نہ رکھے گا کہ ہم ادبی مشاعروں کی طرح کبھی کبھی "قرآنی مشاعرے" کر کے دل بہلا لیا کریں۔ بلکہ یہ بھی چند روز

کی بات ہوگی۔ ہمارے بعد جو نسلیں آئیں گی ان کو دل بہلانے کے لیے بھی اس کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ لہٰذا جب ہمارا مقصد جماعتی تشکیل کو اسلامی بنانا ہے تو ہم غیر اسلامی نظریات و افکار کی طرح اُن معاشی اور سیاسی تحریکات کے خلاف بھی جنگ کرنے پر مجبور ہیں جو غیر اسلامی اصول پر ہوں، اور ہم کسی طرح بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی امامت و قیادت کا منصب غیر مسلم کو حاصل ہو جائے۔

مسلمان کے نقطۂ نظر سے "غیر مسلم" کی امامت تمام فتنوں اور فسادوں کا سرچشمہ ہے۔ امام کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ آگے چلنے والا ہو اور دوسرے اس کے پیچھے چلیں۔ یہ پیچھے چلنا خواہ طوعاً ہو یا کرہاً، خواہ اُس کی امامت کو پسند کر کے اس کا اقتدا کیا جائے، یا مصلحت و ضرورت کی بنا پر اسے گوارا کر لیا جائے، یا اس کی امامت مسلط ہو چکی ہو اور مجبوراً اسے قبول کیا جائے، بہر صورت اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ جدھر امام جائے گا مقتدی بھی اسی طرف جائیں گے، اور ظاہر ہے کہ غیر مسلم امام سمت کعبہ کی طرف تو جانے سے رہا۔ جو شخص سرے سے اصول اسلام ہی سے جاہل ہو اور جس کے سامنے زندگی کے کچھ دوسرے ہی اصول ہوں اس کے پیچھے چل کر مسلمان کس طرح یہ امید کر سکتا ہے کہ اُسے اپنے مقصدِ حیات کو پہنچنا نصیب ہوگا؟ اُس کی قیادت میں تو مسلمان کو اپنی منزل مقصود کے خلاف ہی سفر کرنا پڑے گا، خواہ طوعاً کرے یا کرہاً۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ موٹر پر سوار ہوں اور ڈرائیور کوئی دوسرا شخص ہو۔ آپ کو بہر حال اسی طرف جانا پڑے گا جس طرف ڈرائیور جانا پسند کرے گا، خواہ آپ ادھر جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بس اتنا ہی ہے کہ اسی موٹر میں بیٹھے بیٹھے اپنا منہ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف پھیر لیں۔ اس احتجاج یا طفل تسلی سے آپ کے سفر کا رُخ ہرگز نہ بدلے گا، البتہ دوسرے کے ہاتھ میں اسٹیرنگ چھوڑ دینے کی حماقت پر ایک اور حماقت "پشت بمنزل چلنے" کی حماقت کا اضافہ ضرور ہو جائے گا۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ اللہ نے

کافروں کے لیے اہل ایمان پر نفوذ و اثر کا کوئی راستہ نہیں رکھا۔ اور اسی لئے فرمایا گیا کہ:

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔

(البقرہ - ۱۴)

تم سے نہ یہودی راضی ہوں گے اور نہ نصاریٰ جب تک کہ تم اُن کے طریقہ کی پیروی قبول نہ کرلو۔ صاف صاف کہدو کہ سیدھا راستہ صرف خدا کا راستہ ہے۔ ورنہ اگر کہیں تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی قبول کرلی درآنحالیکہ تمہارے پاس راہ راست کا علم آچکا ہے، تو اللہ کی پکڑ سے کوئی حامی و مددگار تمہیں نہ بچا سکیگا۔

یہ ایک اصولی حقیقت ہے۔ وقت اور حالات اور مقامات کی اس میں کوئی قید نہیں۔ اس بات کو ایک دائمی اصول اور قاعدۂ کلیہ کے طور پر جان لیجیے کہ "مسلمان" پیچھے چلنے کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ اسے یا تو دُنیا کا امام ہونا چاہیے، یا کم از کم خود اپنی راہ چلنا چاہیئے۔ جہاں یہ غیر مسلم کے پیچھے چلا اور بس سمجھ لیجیئے کہ اسی آن سمت کعبہ کے خلاف اس کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ممکن ہے کہ سفر کی ابتدائی منزلوں میں کچھ مدت تک اور کافی دور تک اس کی پیشانی پر سیاہ گٹّہ نظر آتا رہے اور اس کی زبان سے تلاوت قرآن کی آواز بھی سنی جاتی رہے، مگر اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ یہ چیز بہرحال عارضی ہوگی۔ اور اس میں مسلمان ہی کی کچھ خصوصیت نہیں۔ جو شخص بھی اپنا کوئی مسلک اور اپنے کچھ اصول رکھتا ہے وہ غیر مسلک اور مخالف اصول والے کو اپنا امام نہیں بنا سکتا، اور اگر بنائے گا تو اپنے اصول اور مسلک سے منحرف ہوتا چلا جائے گا۔

میں امامت کے لفظ کو اس کے وسیع معنوں میں لے رہا ہوں۔ علوم و فنون میں، خیالات اور نظریات میں، تمدن اور معاشرت میں، قانون اور سیاست میں، غرض زندگی کے جس میدان میں بھی غیر مسلم

آپ کا امام ہے، اس میں آپ کا قدم ارتداد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ اس باب میں جغرافی یا نسلی فرق و امتیاز کو کوئی وزن دوں ـــــ آپ کا امام خواہ انگریز ہو یا جرمن یا روسی یا ہندوستانی اگر وہ غیر مسلم ہے تو میں یہی کہوں گا کہ اس کا اتباع مسلمان رہتے ہوئے آپ نہیں کر سکتے ـــــ میری نگاہ میں اسپنسر اور رسل، مارکس اور لینن، چیمبرلین اور لن لتھ گو کی جو حیثیت ہے وہی گاندھی اور جواہر لال اور بوس اور پٹیل کی حیثیت ہے۔ مسلمان شرقی اور غربی نہیں جانتا۔ وہ صرف مسلم اور کافر کا فرق جانتا ہے۔ اگر وہ مسلم ہے تو اپنے اعتقاد اور افکار میں، اپنے تمدن اور معاشرت میں، اپنی سیاست اور قانون میں اس کو آزاد ہونا چاہیے، اور قرآن و سنت کے سوا کسی کی امامت قبول نہ کرنی چاہیے۔

یہی بات ہے جس کو میں اوّل روز سے کہتا آرہا ہوں اور آخر وقت تک کہتا رہوں گا۔ پہلے اس بات کو علمی و فکری اور تمدنی و معاشرتی معاملات میں کہتا تھا۔ آج اُسی کو سیاسی و معاشی معاملات میں کہتا ہوں مجھے سیاسی پارٹیوں کی مصلحتوں سے کچھ سروکار نہیں۔ اور مجھے چھوٹی اور بڑی شخصیتوں کی بھی کوئی پروا نہیں۔ جمعیۃ العلما کا نقیب ہو یا مسلم لیگ کا لیڈر، جو کوئی بھی زندگی کے کسی راستہ میں غیر مسلموں کا اتباع کرتا ہے، میں بلا کسی مداہنت کے صاف کہتا ہوں کہ وہ قرآن کی اصولی تعلیم کے خلاف چلتا ہے اور اس کو مسلمانوں کی پیشوائی کا حق نہیں پہنچتا۔ البتہ فرنگیت مآب لوگوں سے، جن کو کبھی اسلامی تعلیم و تربیت کی ہوا تک نہیں لگی، مجھ کو اتنی شکایت نہیں جتنی ان حضرات علماء سے ہے جو اپنا رشتہ تو جوڑتے ہیں شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید سے، مگر جن پر غیر مسلموں کے سیاسی عروج کا رعب اس قدر طاری ہو گیا ہے کہ وہ علی الاعلان اپنی مغلوبیت کا اظہار کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان میں سے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ "میں کانگریسی مروں گا"، حالانکہ اللہ نے ان کو مسلمان مرنے کی ہدایت کی تھی۔ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ کوئی صاحب گاندھی جی کے عدم تشدد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ قیام مکہ کے طرز عمل سے تشبیہ دیتے ہیں، حالانکہ دونوں کی اعتقادی اساس

اور اخلاقی فلسفہ میں اتنا عظیم تفاوت ہے جتنا نور اور ظلمت میں ہو سکتا ہے۔ کوئی صاحب گاندھی جی کی پیروی کرنے کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر غیر مسلم بدرقہ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ حالانکہ بدرقے اور سیاسی لیڈر میں جو فرق ہے اس کو ایک جاہل بھی سمجھ سکتا ہے۔ یہ اور ایسی ہی بیسیوں لغویات سننے اور پڑھنے کے بعد ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور مجبوراً ان حضرات سے کہنا پڑتا ہے کہ جب قرآن و حدیث کی تعلیم میں عمریں گذار دینے کے بعد آپ کا یہ حال ہے تو آپ کس منہ سے ان پر اعتراض کرتے ہیں جن کی ساری عمریں فرنگیت میں گذری ہیں حنظل سے حنظل کا مزا پانا اتنا تکلیف دہ نہیں جتنا شہد سے حنظل کا مزا پانا۔

غیر مسلم کی امامت و قیادت کے نتائج اب ہمارے لیے محض نظری و قیاسی نہیں رہے ہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے نے ان کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے اور اب ہم سخت نادان ہوں گے اگر اس زہر کو کسی شکل اور کسی صورت میں بھی حلق سے اُتارنے پر راضی ہوں۔ ہم نے تعلیم گاہوں میں فرنگی پروفیسروں کی امامت قبول کی اور انہوں نے ہماری نئی نسلوں کو دل و دماغ کے اعتبار سے مرتد بنا کر چھوڑ دیا۔ ہم نے تمدن و معاشرت میں "صاحب" کو امام بنایا اور انہوں نے ہمارے گھروں تک کے نقشے بدل ڈالے، حتیٰ کہ ہماری عورتیں تک اُن کی عنایت سے اس شان کے ساتھ پھرنے لگیں جس کے ساتھ کبھی ہمارے ہاں کی زنانِ بازاری بھی پھرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ ہم نے قانون میں "صاحب" کی امامت تسلیم کی، اور انہوں نے ہم کو وہ قانون دیا جس کی بدولت ہمارے حلال و حرام کے معیار تک بدل گئے، اخلاقی قدریں تک اُلٹ گئیں، ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں اب یہ سن کر حیرت سے پھٹ جانے لگیں کہ زنا کی سزا رجم یا سو کوڑے ہیں، اور چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، اور شراب پینے والا ایسا مجرم ہے کہ اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے جانے چاہئیں۔ ہم نے معیشت میں "صاحب" کی امامت مانی تو انہوں

لئے ہم پر وہ نظام معاشی مسلّط کیا جس کی بدولت ہمارے ہاں سُود کی حرمت ہی مشتبہ ہو کر رہ گئی، لوگوں کے دماغ یہ سمجھنے سے عاجز ہو گئے کہ یہ لاٹری، یہ انشورنس، یہ بینکنگ بھی کوئی حرام چیزیں ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری قوم میں وہ طبقہ پیدا ہوا جس کے لیے زکوٰۃ حرام اور سود حلال ہے۔ ہم نے "صاحب" کو سیاست میں امام مانا تو اُنہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم کو غلامی کی مکمل ٹریننگ دی اور ہمیں اتنا ذلیل بنا دیا کہ ہزار برس کے غلام تو اپنی حکومت کے خواب دیکھ سکتے ہیں مگر ہم میں یہ خواب دیکھنے کی بھی جرأت نہ رہی۔

اب ہمارے دل میں دنیائے اسلام اور وطن عزیز کی آزادی کا درد اٹھا بھی تو وہ اس فتنۂ سامانی کے ساتھ اٹھا کہ صاحب کے بجائے ہم لالہ و پنڈت کے آگے دست بیعت دراز کر رہے ہیں۔ اس کی ابھی ابتدا ہے اور ابھی سے بس بھری فصل کٹنی شروع ہو گئی ہے۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے والوں، گاندھی جی کی تقلید میں برت رکھنے والوں، جھنڈے کی سلامی اتارنے والوں، مسلم جج کے مطالبہ پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی مثالیں پیش کرنے والوں کا ذکر چھوڑیے۔ اُن "مجاہدین" ملّت کی طرف دیکھیے جو فرماتے ہیں کہ اسلام کے لیے قربانیاں کرنے والا ہمارے سوا کوئی نہیں۔ اسلام کی حکومت قائم کرنے کا تخیل ان کے لیے اتنا ہولناک ہے کہ اس کو زبان پر لانا ان کے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ اگر کوئی کہدے کہ حکومت صرف اسلام کی ہونی چاہیے اور غیر مسلم کے لیے ذمّی کے سوا کوئی حیثیت اس میں نہیں ہو سکتی، تو اس خطرناک بات کو سن کر ان پر لرزہ چڑھ جاتا ہے۔ جمہوریت کے سراسر باطل اصول پر چون و چرا کرنے کی ہمت بھی وہ اپنے اندر نہیں پاتے۔ وہ تمنّائیں وابستہ کرتے ہیں ایسی ذلیل باتوں سے کہ مثلاً گاندھی مہاراج کی جگہ بوس مہاراج دلی نعمت ہو جائیں تو بس بیڑا پار ہو جائے ـــــ بالکل اسی طرح جیسے غلامی فرنگ کے زمانۂ عروج میں قیاس دوڑائے جاتے تھے کہ فلاں لارڈ صاحب کی جگہ فلانے صاحب بہادر تشریف لے آئیں تو کیا ہی اچھا

ہو ـــــــ اس قسم کی گھٹیا درجہ کی مصلحت بینیوں کو یہ لوگ "سیاست دانی" سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسی سیاست اور ایسا تدبّر صرف انہی لوگوں کا طغرائے امتیاز ہو سکتا ہے جن کو غلامی اور شکست خوردہ ذہنیت نے پست حوصلہ اور تنگ نظر بنا دیا ہو۔

ان نتائج کو دیکھ لینے کے بعد اس منبع فتنہ و ضلالت سے جس کا نام امامت غیر مسلم ہے، کسی خفیف سے خفیف درجہ میں بھی مصالحت کا خیال نہیں کیا جا سکتا ـــــ کیا ان کروڑوں کلمہ گوؤں کی آبادی میں سے چند مردانِ حق بھی ایسے نہ نکلیں گے جو کھڑے ہو کر صاف اعلان کر دیں کہ اطاعت اور اتباع صرف اللہ اور اس کے قانون کے لیے ہے، اور جو اس قانون کو نہیں مانتا اس سے ہماری جنگ ہے، خواہ وہ باہر سے آیا ہو یا اسی سرزمین سے ابھرا ہو؟

مقالات

دلائل السنن والآثار

(۴)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

تابعین کا دور صحابۂ کرام کے بعد تابعین بالاحسان ان کے علم کے وارث ہوئے اور اہنوں نے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں سُنّت نبوی کے علم کو پوری حفاظت کے ساتھ پھیلایا اور اس طرح منضبط کر دیا کہ اس میں جعل سازی کرنا کوئی آسان کام نہ رہا جیسا کہ آجکل بعض ناواقف بدگمان لوگ خیال کرتے ہیں۔ اس گروہ میں روایت حدیث کے رُکن اعظم محمد بن مُسلم معروف بہ ابن شہاب زہری ہیں سنہ ۵۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، سعید بن المسیب وغیرہ سے روایت حدیث کی۔ لیث بن سعد کا قول ہے کہ میں نے زہری سے زیادہ جامع علم کبھی نہیں دیکھا۔ قرآن، حدیث، کلام عرب اور انساب کے متعلق ان سے بہتر کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہے کہ زہری سے زیادہ حدیثوں کا عالم کوئی باقی نہیں رہا۔ مکحولؒ کا قول ہے ما رایتُ احداً اعلم بسنة ماضية من الزهری[1] امام مالک کا بیان ہے کہ "ابن شہاب مدینہ میں آئے تو ربیعہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں دفتر میں گئے لیکن جب عصر کے وقت دفتر سے نکلے تو ابن شہاب یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے کہ میرے خیال میں ربیعہ کا مثل مدینہ میں کوئی نہیں۔ اور ربیعہ یہ کہتے ہوئے چلے کہ میرے نزدیک ابن شہاب علم کے جس درجہ کو پہنچ گئے ہیں اس درجہ کو کوئی نہیں پہنچا۔ آپ کی وفات سنہ ۱۲۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے فتاویٰ کو محمد بن نوح نے جمع کیا

[1] معرفۃ علوم الحدیث

تو تین جلدیں ہوئیں۔

ابنِ شہاب زہریؒ کے شاگرد پانچ طبقوں میں منقسم ہیں۔ علامہ حازمیؒ نے ان طبقات کو غایت تحقیق اور وقت نظر سے متعین فرما کر قیامت تک کے لئے بہت سے شکوک و شبہات کو ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ ائمہ حدیث کے مشرب و مسلک کی توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں،۔

"ان میں سے ہر طبقہ اپنے سے نیچے کے طبقے پر فضیلت رکھتا ہے۔ طبقہ اوّل اعلیٰ درجہ کی صحت کا حامل ہے، اور یہی امام بخاریؒ کا مستند علیہ ہے۔ طبقہ ثانیہ اگرچہ پہلے طبقہ والوں کے ساتھ ثبت ثقاہت وغیرہ میں تو شرکت رکھتا ہے لیکن پہلا طبقہ حفظ، اتقان، اور زہری کی طویل صحبت سے مستفید ہونے میں طبقہ ثانیہ سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ زہری کے ساتھ سفر اور حضر میں اس نے ملازمت اختیار کی اور ان کی حدیثوں کی بخوبی ممارست کی اور اچھی طرح جانچ پڑتال فرمائی۔ اسوجہ سے طبقہ اولیٰ کی حدیثیں زیادہ قابل وثوق ہوئیں۔ طبقہ ثانیہ نے امام زہریؒ کی صحبت زیادہ نہیں پائی اس لیے ان کو یہ بات حاصل نہ ہو سکی نہ ان کو حدیث زہری سے چنداں ممارست ہوئی۔ یہی شرط امام مسلم کی ہے۔ بہر حال طبقہ اولیٰ کے رواۃ امام بخاری کے شرط ہیں۔ کبھی کبھار طبقہ ثانیہ کے رواۃ کی احادیث کو بھی جن پر امام کو اعتماد ہے صحیح بخاری کے اندر لاتے ہیں لیکن بالاستیعاب نہیں۔ بخلاف امام مسلم کے کہ یہ دونوں طبقوں کی احادیث کو بالاستقصاء ذکر کرتے ہیں۔ تاہم طبقہ ثانیہ و ثالثہ کے رواۃ کی حدیثیں بھی امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کی ہیں (ثانیہ سے زیادہ، ثالثہ سے کم) طبقہ اولیٰ میں امام مالکؒ سفیان ابن عیینہؒ، عبید اللہ بن عمرؒ، یونس بن یزید، عقیل بن خالد، شعیب بن ابی حمزہ وغیرہ حضرات شامل ہیں اور طبقہ ثانیہ میں امام اوزاعی، لیث بن سعد، نعمان بن راشد، عبدالرحمٰن بن خالد بن مسافر، ابن ابی ذئب وغیرہ

یہ ان رواۃ کی حالت ہے جو کثیر الحدیث ہیں۔ رہے وہ رواۃ جو قلیل الحدیث ہیں تو ان سے امام بخاریؒ کبھی کسی متفرد راوی کی حدیث نہیں لیتے جب تک کہ سلسلہ رواۃ میں اسکا کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ ہاں کبھی کسی راوی پر باوجود تفرد کے جب قوی اعتماد ہو جاتا ہے تو اس کی حدیث لے لیتے ہیں، جیسے یحییٰ بن سعید انصاریؒ

مرداس اسلمی، زاہر بن اسود الاسلمی، عبداللہ بن ثعلبہ، ابوسعید بن المعلی، ابوعقبہ سوید بن نعمان۔ ان چند اسماء کے سوا شاید ہی اور موجود ہوں اور یہ بھی شاذ و نادر کے حکم میں ہیں۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے بھی یہی روش اختیار کی۔

طبقہ ثالثہ میں ایسی جماعت ہے جس نے مثل طبقہ اولیٰ کے امام زہری سے ملازمت تو کی ہے لیکن یہ جماعت مفسدہ جرح سے محفوظ نہیں ہے، اس لیے ان کی بعض حدیثیں قبول کی گئی ہیں اور بعض رد کر دی گئی ہیں یہی رواۃ ابوداؤد اور نسائی کے شروط ہیں، مثلاً سفیان بن حسین اسلمی، جعفر بن برقان، عبداللہ بن عمر بن حفص العمری، زمعہ بن صالح المکی، اسحاق بن یحییٰ الکلبی وغیرہ۔

چوتھا طبقہ ایک ایسی جماعت اور قوم کا ہے جو طبقہ ثالثہ کے ساتھ جرح و تعدیل میں شریک ہیں لیکن قلت ممارست کی وجہ سے حدیث زہری میں منفرد ہیں، اس لیے کہ امام زہری کی صحبت انہیں کم نصیب ہوئی ہے یہی شرط امام ابوعیسیٰ ترمذی کی ہے، مثلاً ربیعہ بن صالح، معاویہ بن یحییٰ الصدفی، مثنیٰ بن صباح، اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فروۃ المدنی، ابراہیم بن یزید المکی وغیرہ"

اس کے بعد علامہ حازمی فرماتے ہیں کہ "حقیقۃً شرط ترمذی، ابوداؤد کی شرط سے زیادہ بہتر ہے اس لئے جب حدیث ضعیف ہو اور اس کے رواۃ طبقہ رابعہ کے لوگ ہوں اور وہ ان کے ضعف سے مطلع کر تا جائے تو ایسی حالت میں یہ حدیث اس کے نزدیک شواہد اور متابعات کے قبیل سے سمجھی جائے گی، گویا اس امام نے ایک جماعت کی صحت پر اعتماد کیا ہے۔ چنانچہ کتاب ترمذی اسی فن پر مشتمل ہے[1]"

میرے نزدیک اصل حقیقت یوں ہے کہ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی کا رتبہ امام ترمذی سے بہ حیثیت مجتہد ہونے کے بلند ہے۔ ترمذی کو رتبۂ اجتہاد حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوداؤد سند کے بجائے متن پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سنن ابی داؤد کے دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ طرق، اختلاف الفاظ اور

[1] شروط الائمہ

زیادات کو ایک دوسرے سے واضح فرماتے ہیں کیونکہ فقہ حدیث کی جانب امام کی توجہ بہت زیادہ ہے۔ اور اسی خیال سے وہ صحیح سند لاتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسنادِ معلل کا سرے سے ذکر تک نہیں کرتے۔ تفصیل کے لئے امام کا وہ خط ملاحظہ کرنا چاہیئے جس کو انہوں نے اہلِ مکہ کے لئے لکھا ہے۔

پانچواں طبقہ ضعفاء اور مجہولین کا گروہ ہے۔ امام ابو داؤد کے نزدیک اس گروہ سے حدیث لینا اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جو ابواب کے ماتحت احادیث کی تخریج کرتا ہے، الا علی سبیل الاعتماد والاستشہاد لیکن حضرات شیخینؒ سرے سے اسکے مخالف ہیں۔

اس موقعہ پر ایک بات صاف کر دینی چاہیئے جس میں اہل علم مختلف الرائے ہیں وہ یہ کہ آیا صحیح مسلم میں دوسرے طبقے کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں؟ حاکم اور امام بیہقی کا خیال ہے کہ امام کی موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کی تخریج کا موقعہ نہیں دیا۔ لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقے کی حدیثیں موجود ہیں اور اس تحقیق کے لحاظ سے صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً محدثین نے مردود قرار دیا ہے ہر قسم کی روایات درج ہیں۔ عموماً محدثین کے نزدیک جب حدیث متصل الاسناد ہو شروع سے آخر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے آئی ہو، شذوذ اور علۃ سے خالی ہو تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم۔ مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابو زبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحت کے تمام شرائط موجود نہیں اس لیے وہ ان سے روایت نہیں کرتے۔ اس کے بخلاف امام مسلم کے نزدیک قابلِ اعتبار ہیں۔ اسی طرح عکرمہ، عمرو بن مرزوق وغیرہ سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن مسلم ان کو قابلِ روایت قرار نہیں دیتے۔ اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس رواۃ سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے ۶۲۵ راویوں سے روایت نہیں کی۔

اسی طرح مقبول اور معتبر رواۃ میں بھی مراتب کا فرق ہے۔ مثلاً حسن بصری اور ابن سیرین کے

کے دو شاگرد ہیں جو تقویٰ، امانت اور احتیاط میں بہت عالی مرتبہ ہیں یعنی ابن عون اور ایوب سختیانی۔ انہیں کے دو شاگرد اور ہیں عوف بن جمیلہ اور اشعث الحمرانی جو معتبر تو ہیں مگر مرتبہ میں ابن عون اور ایوب سختیانی سے کم ہیں۔ اگر کوئی روایت عوف اور اشعث کی ابن عون اور ایوب کے خلاف ہو تو محدثین اس بنا پر اس سے انکار کر دیں گے کہ ان سے زیادہ معتبر لوگوں نے ان کے خلاف روایت کیا ہے۔ یا مثلاً عطاء ابن السائب، یزید بن ابی زیاد اور لیث بن سلیم محدثین کے نزدیک معتبر اور مستند ہیں لیکن ان کا مرتبہ اسمٰعیل بن ابی خالد، سلیمان اعمش اور منصور معتمر کے مثل نہیں ہے لہٰذا اگر کوئی روایت عطاء، یزید، اور لیث کی ان کے خلاف ہو تو محدثین کے نزدیک مقبول نہ ہو گی۔

دورِ تدوین بہرحال مذکورہ بیان اور فرقِ مراتب کے سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جس طرح امام زہری کے تلامذہ کے طبقات ہیں بعینہٖ اسی طرح امام نافع اور امام اعمش و قتادہ کے بھی ہیں۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد بہت سی فنی زحمتیں ختم ہو جاتی ہیں اور طالب حق کے لئے تحقیق و جستجو کی راہیں باز ہو کر تقلید ہی جہالت اٹھ جاتی ہے۔ اس کا خلاصہ بقول علامہ ابن المدینی یہ ہے کہ سنن و آثار نبوی صلعم کے رکن اعظم جن پر حدیث نبوی کی بنیاد رکھی جاتی ہے چھ حضرات ہیں یعنی امام زہری مدینہ میں۔ عمرو بن دینار مکہ میں۔ قتادہ و یحییٰ بن کثیر بصرہ میں۔ ابو اسحاق اور سلیمان اعمش کوفہ میں۔ پھر ان چھ حضرات کے علم کی فہرست بہت طویل ہے۔ تاہم طبقہ اولیٰ کے مصنفین جنہوں نے سنن و آثار نبوی کو جمع کیا ہے ان کی تاریخی حیثیت دوسری صدی کی ابتدا سے شروع ہو کر چوتھی صدی کے نصف تک قائم رہتی ہے۔ یہی دور حدیث و فقہ کی تدوین اور ان ائمہ کبار کے پیدا ہونے کا دور ہے جن کو عام طور پر لوگوں نے اپنا پیشوا تسلیم کیا ہے علم حدیث کے لیے یہ دور بہترین دور تھا کیونکہ اس دور میں رواۃ حدیث نے اس علم کی تصنیف و تدوین کی ضرورت کو محسوس کیا یعنی یہ کہ ایک ہی قسم کی حدیثوں مثلاً نماز اور روزے وغیرہ کو باہم ایک ہی سلسلہ میں جوڑ دیا جائے یہ خیال تمام اسلامی شہروں میں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوا یہاں تک کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے

تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے۔ تاہم اتنا مسلم ہے کہ مدینہ میں امام مالک، مکہ میں عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج اور سفیان بن عیینہ، کوفہ میں سفیان ثوری، بصرہ میں حماد بن سلمہ وسعید بن ابی عروبہ وربیع بن صبیح واسط میں ہشیم بن بشیر، شام میں عبدالرحمٰن اوزاعی ومحمد بن اسحٰق ووکیع بن الجراح، یمن میں معمر بن راشد وعبدالرزاق، خراسان میں عبداللہ بن مبارک، رے میں جریر بن عبدالحمید وغیرہ تھے، اور یہ کچھ اوپر ۱۴۳ھ کا زمانہ تھا۔ ان کتابوں میں جیسا کہ ہم کو مؤطا امام مالکؒ میں نظر آتا ہے حدیث نبوی صحابہ وتابعین کے اقوال کے ساتھ مخلوط تھی۔ لیکن ان لوگوں کے بعد دوسری صدی کے آغاز میں دوسرے طبقہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلعم کی احادیث کو دوسرے لوگوں کے اقوال سے الگ کرنا مناسب سمجھا اور وہ کتابیں تالیف کیں جو مسانید کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً مسند عبداللہ بن موسیٰ کوفی، مسند مسدد بن مسرہد البصری، مسند اسد بن موسیٰ المصری، مسند نعیم بن حماد الخزاعی، مسند اسحٰق بن راہویہ، مسند عثمان بن ابی شیبہ اور مسند امام احمد بن حنبل۔ ان حضرات نے احادیث کو ان کے راویوں کے مسانید میں درج کیا مثلاً مسند ابوبکر صدیق وغیرہ۔

اس طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے سامنے اس عظیم الشان ذخیرے کو دیکھا تو اپنے لیے انتخاب کا دروازہ کھولا اور اس طبقہ کے سرخیل امام بخاری اور امام مسلم ہوئے جنہوں نے روایت وانتخاب میں نہایت چھان بین کے بعد صحیحین کو تصنیف فرمایا۔ انہیں اکابر کی روش دیگر ارباب صحاح نے اختیار کی۔

ایک اصولی تشریح امام زہریؒ سے پہلے سیرت اور حدیث کے عالموں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا البتہ بعض علماء صاحب المغازی کے نام سے مشہور تھے، شاید اس وجہ سے کہ ان کو مغازی کی روایتیں زیادہ معلوم تھیں یا اس وجہ سے کہ مغازی کی روایتیں زیادہ بیان کرتے تھے۔

امام زہری کے وقت میں چار عالم بے نظیر سمجھے جاتے تھے، ابن المسیب مدینہ میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں اور مکحول شام میں۔ یہ سب ائمہ سیر بھی ہیں اور ائمہ حدیث بھی۔ زہری ان چاروں کے فیض یافتہ تھے۔ چنانچہ امام زہری کے شاگردوں ہی نے سنن اور سیرۃ کو بظاہر دو فنون کی حیثیت سے نمایاں

کیا۔ ایک طرف امام مالک اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمۂ حدیث ان کے شاگرد تھے جنہوں نے علم حدیث کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ دوسری طرف امام السیر والاخبار محمد بن اسحٰق اور موسیٰ بن عقبہ ان کے شاگرد تھے جن کی روایات اور تصنیفات سے فن سیرۃ ایک مستقل فن بن گیا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اصحاب سیر اور ارباب حدیث واقعی دو جماعتیں نہیں ہیں۔ جتنے اصحاب سیر ہیں وہ اصحاب حدیث بھی ہیں اور جتنے اصحاب حدیث ہیں وہ اصحاب سیر بھی۔ مگر سیرت پر جب ان کو واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیرۃ کے مقاصد کو پورا کرنا ہوتا ہے تو اس کے شرائط اور وجوہ ترجیح میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اصحاب حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں:۔

(۱) رسول اللہ صلعم نے کیا فرمایا،

(۲) رسول اللہ صلعم نے کیا کام کیا،

(۳) رسول اللہ صلعم کے سامنے یا آپ کے وقت میں کیا کیا گیا۔

اصحاب سیرۃ بھی انہی تین باتوں کو جمع کرتے ہیں اس لئے اصل کام دونوں کا ایک ہے۔ مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور آنحضرت صلعم کی ذات سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے۔ اس لئے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا یہ قول رسول اللہ صلعم کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق میں صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن اصحاب سیرۃ کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ دو۲ باتیں اور معلوم کرنی ہوتی ہیں (۱) یہ کہ حضورؐ نے کب ایسا کہا یا کیا، (۲) یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی۔ اصحاب سیرۃ آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قول و فعل رسول اللہ کا ہے تو وہ رسول اللہ صلعم کی سُنّت اور آپ کا طریقہ ہو گیا۔ گو یہ نہ معلوم

ہو کہ رسول اللہ نے کب، کس دن، اور کس تاریخ کو ایسا کہا یا کیا۔ اس فرق کی وجہ سے اصحاب سیرۃ اور اصحاب حدیث کی دو جماعتیں الگ الگ بن گئیں اور معیار تحقیق بھی دونوں کا جدا ہو گیا۔ محدثین رواۃ کی ثقاہت، تقویٰ اور دیانت کی کمی زیادتی کی بنا پر مقبول رواۃ کی روایتوں میں اختلاف کے وقت ترجیح دیتے ہیں۔ اور اصحاب سیرۃ حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہر حال اصحاب حدیث ہوں یا اصحاب سیرۃ، ان میں سے کوئی بھی جھوٹوں کی روایتیں اور جن راویوں پر جرح شدید ہو ان کے بیانات کو قبول نہیں کرتا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب بیان کیا جاتا ہے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں کوئی روایت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے نہیں لی ہے باوجود اس کے کہ امام بخاریؒ، امام ابو حنیفہؒ کے چھوٹے سے چھوٹے اصحاب سے ملے اور ان سے استفادہ کیا۔ اسی طرح امام بخاری نے امام شافعیؒ سے بھی روایت حدیث نہ کی، باوجود اس کے کہ ان کے بعض اصحاب سے امام بخاری کی ملاقات ثابت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات محدثین کے تقدس اور تورع، امانت اور کمال دینداری کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کسی تعصب اور بیجا حمایت سے ایسا کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ تاج الدین سبکی طبقات کبریٰ میں فرماتے ہیں:۔

وذکر الشافعی فی موضعین من صحیحہ فی باب فی الرکاز الخمس وفی باب تفسیر العرایا من البیوع ورقم شیخنا المزی فی التہذیب الشافعی بالتعلیق وذکر ہذین المکانین،	امام بخاری نے اپنی صحیح میں امام شافعی کا ذکر دو جگہ کیا ہے (۱) باب فی الرکاز الخمس (۲) باب تفسیر العرایا (کتاب البیوع) میں اور علامہ مزی نے ان دونوں مقاموں کا ذکر تہذیب میں کیا ہے۔

پھر دفع دخل کے طور پر علامہ سبکی اس سوال کے جواب میں کہ امام شافعی سے روایت کیوں نہیں کی

لکھتے ہیں :-

ولم یرو عن الشافعی فی الصحیح لانه ادرك اقرانه والشافعی مات مکتهلا فلا یرویه نازلاً

یعنی امام بخاریؒ نے کوئی حدیث امام شافعی کے واسطے سے اپنی جامع صحیح میں اس واسطے روایت نہیں کی کہ امام بخاری نے امام شافعی کے اقران کو پایا اور ان کے معاصرین سے اخذ روایت کیا، چونکہ امام شافعی کا انتقال سن کہولت ہی میں ہو گیا تھا اگر امام شافعی کے واسطے سے روایت کرتے تو حدیث کے سلسلہ سند میں واسطہ بڑھ جاتا اور سند نازل ہو جاتی اس لیے امام شافعیؒ کے واسطے سے بخاری نے کوئی روایت نہیں کی۔"

اور امام ابو حنیفہؒ سے روایت نہ کرنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا " الایمان قول و عمل"۔ مگر یہ بات صحیح نہیں اس لیے کہ خود صحیح بخاری کے سلسلہ اسانید میں ایسے رواۃ موجود ہیں جن کی نسبت "مرجی" لکھا گیا ہے جو اعمال کو جزو ایمان نہیں مانتے تھے۔ اسی طرح بخاری کے بعض رجال کے متعلق شیعیت اور ایسے ہی دوسرے امور بھی مذکور ہیں جن سے اعتقاداً امام بخاری کو اختلاف ہے لیکن شرائط یعنی عدل، صدق، حافظہ، دیانت وغیرہ موجود ہونے پر کمال بے تعصبی کے ساتھ وہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ امام بخاری "الایمان قول و عمل" کے باب میں بڑی شدت رکھتے تھے جس کی شہادت صحیح بخاری کی کتاب الایمان سے بھی ملتی ہے۔ نیز ان کا یہ قول مشہور ہے کہ "میں نے ہزار سے زائد شیوخ سے حدیث لی لیکن ایسے شیوخ کے پاس نہیں گیا جو الایمان قول و عمل کے قائل نہ تھے"[1] لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس قول سے امام بخاری کا تشدد "اپنے شیوخ تک ہی محدود رہتا ہے۔ اوپر کے سلسلہ میں یہ

[1] مقدمہ فتح الباری وغیرہ

توجیہہ سرے سے باطل ہو جاتی ہے۔

دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ائمۂ کوفہ کا میلان اقوال الرجال سے تخریج مسائل اور تفریع احکام کی طرف کچھ اس طرح بڑھا کہ انہیں خود اپنے ائمہ کی روایت اور ان کی تحقیق پر اعتماد نہیں رہا۔ اس کا ثبوت امام محمدؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے:۔

ما اعلم اسوء ثناء علی اصحابہ منکم۔ اذا حدثتکم عن مالک ملأتم علی الموضع۔ واذا حدثتکم عن اصحابکم انما تاتون متکارھین [1]	کوفہ والو! تم سے بڑھ کر اپنے شیوخ سے بدظن میں نے کسی کو نہیں پایا۔ جب امام مالک سے حدیث بیان کرتا ہوں تو تم لوگوں سے میرا گھر بھر جاتا ہے۔ اور جب خود تمہارے اپنے ائمہ اور شیوخ سے روایت کرتا ہوں تو تم بکراہت مجلس میں آتے ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مصفّٰی میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:۔

"آں امام ابوحنیفہ یک شخصے است کہ رؤس محدثین مثل احمد و بخاری و مسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ و دارمی از وے در کتابہائے خود روایت نہ کردہ اند و رسم روایت حدیث از وے بطریق ثقاۃ جاری نہ شدہ"

بہر حال جو وجہ بھی ہو میری رائے اس سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حضرات محدثین کا خیال غالباً یہ تھا کہ ان ائمہ کرام و مجتہدین عظام کی حدیثیں تو ضائع اور برباد ہونے سے محفوظ ہیں اس لئے کہ ان کے تلامذہ اور اصحاب چار دانگ عالم میں کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے ہاں روایت کے ساتھ ساتھ عمل بھی مشہور و معروف طریقہ پر جاری ہے۔ اس لئے انہوں نے ان کی احادیث کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنی جدوجہد زیادہ تر اُن رواۃِ حدیث کی جانب مبذول رکھی جن کی روایات کے ضائع ہونے

[1] تہذیب الاسماء واللغات،

کا خطرہ تھا۔ اگر ان کی سعی بلیغ اور مصروفیت دوسری جانب نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان ائمۂ اسلام کی روایتیں ارباب صحاح کی کتابوں میں نہ ہوتیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو محض محدثین سے حسن ظن اور ان کی حمایت کی بنا پر بات بنالی گئی ہے، اور نہ واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے گروہ مجتہدین پر عموماً جرحیں کی ہیں، مثلاً امام ثوری نے امام ابوحنیفہ پر اور ابن معین نے امام شافعی پر۔ اور کرابیسی نے امام احمد پر اور ذہلی نے بخاری پر جرح کی۔ بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا تحقیقی جواب آپ کو آگے ملے گا۔

شرائط رواۃ حدیث و آثار سیاسی اختلافات اور مذہبی تعصبات کی بنا پر جو لوگ اپنے اپنے طریقوں میں غلو رکھتے تھے ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے عقائد و اعمال کی تائید میں رسول اللہ صلعم سے جھوٹی حدیثوں کی روایت کرنا اپنے لئے جائز کرلیا تھا۔ (امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں بالتفصیل اور دوسرے ائمہ نے اجمالاً پوری طرح ان حقائق کو آشکارا کیا ہے)۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز تک شیعہ، خارجی اور چند دوسرے فرقے وجود میں آچکے تھے اور ہر فرقہ میں خبیث الباطن اشخاص پائے جاتے تھے۔ البتہ ان میں سے خوارج نسبتہً کم دروغگو ہوتے تھے کیونکہ ان کے اصول کی رو سے گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوجاتا ہے اور رسول اللہ صلعم کی نسبت دروغگوئی کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے ان میں اس قسم کی جرأت کرنے والے اشخاص مشکل نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ گروہ بندی شروع ہونے کے بعد سے محدثین کا کام بہت زیادہ سخت ہوگیا، اور اس سخت کام کو جس طریقہ سے انہوں نے انجام دیا اس کی روداد پڑھنے سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات محدثین نے ان آمیزشوں سے حدیث کو کیونکر پاک کیا۔ اور ان کو اس معاملہ میں کیسی درخشاں کامیابی حاصل ہوئی۔

مذہب اسلام کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی جملہ تعلیمات کا رابطہ براہ راست صاحب شریعت علیہ السلام سے ہے۔ شریعت کا ہر جزئیہ آفتاب رشد و ہدایت سے ایک زبردست اور ناقابل

انکار نسبت رکھتا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی چیز آنحضرتؐ سے ثابت نہ ہو، یا کسی ثابت شدہ چیز سے ماخوذ و مستنبط نہ ہو، وہ شریعت کا جزو نہیں بن سکتی۔ اگرچہ تاریخ اسلام کا کوئی دور ایسے اشرار اور کذابوں سے خالی نہیں رہا جنہوں نے غیر شرعی باتوں کو صاحب شریعت علیہ السلام کی طرف منسوب کرکے اس نظام شرعی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتا کہ صاحب شریعت کی ہدایات کو بیرونی آمیزشوں سے پاک کرنے اور پاک رکھنے کا جیسا مکمل انتظام اس مذہب میں کیا گیا ویسا کسی دوسرے مذہب کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور یہیں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت کوئی انسانی کام نہیں ہے بلکہ اپنی آخری شریعت کی حفاظت کے لیے خدا ہی کی طرف سے معجزانہ انتظام کیا گیا ہے۔ ورنہ کوئی شخص بتلائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے عہد رسالت کے سوا دنیا کے اور کس شخص اور کس دور کے متعلق اتنی تفصیلات انسان محفوظ رکھ سکا ہے؟ اور کس شخص یا دور کے حالات کی حفاظت کے لیے اخبار و آثار کی چھان بین اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے اس قدر مکمل ذرائع فراہم کئے جا سکے ہیں؟ یہ محض ایک خوش اعتقادی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک علمی حقیقت ہے جس کو علمی حیثیت سے ہی جانچنا چاہیئے تاکہ نبی آخر الزمان کی تاریخ اور عام انسانی تاریخوں کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے، اور ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جو اس اعجازی تاریخ کو بھی عام تاریخوں کی طرح محض انسانی کارنامہ سمجھ کر ناقابل وثوق ٹھیراتے ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے خالص علمی طور پر تحقیق کرنے والے کو جس طرح حفاظت قرآن میں خدائی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے اسی طرح حفاظت آثار نبوی میں بھی نظر آسکتا ہے بشرطیکہ وہ آرام کرسی پر لیٹ کر تخیلات بارد پر عمارت کھڑی نہ کرے بلکہ تحقیق میں کچھ وقت اور محنت بھی صرف کرنے پر آمادہ ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کا قول یا تو بلاواسطہ سنا گیا ہوگا یا بواسطہ رواۃ۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت تو حجت و یقینی قطعی ہے، اس لیے کہ جب کسی شخص نے خاص ذات نبوی کی زبان سے کوئی

بات سنی ہو تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی صداقت پر یقین نہ رکھے۔ اب رہ گئی دوسری بات یعنی کسی واسطہ سے آنحضرتؐ کا قول سننا۔ تو اس کی پھر دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اتنے کثیر واسطوں سے سنا گیا ہوگا کہ اتنے کثیر راویوں کا جھوٹ پر متفق ہونا مستبعد ہو۔ یا اس قدر کثیر واسطے نہ ہوں گے پہلی صورت بھی یقینی و قطعی ہے۔ کلام صرف دوسری صورت میں رہ جاتا ہے۔ فقہاء و محدثین کی اصطلاح میں وہ ظنّی سے تعبیر کی جاتی ہے، جس کی عقلی طور پر تین شقیں ہو سکتی ہیں:۔ (۱) وہ جس کی صحت کا ظن غالب ہو (۲) وہ جس کا فساد ظاہر ہو (۳) وہ جس میں احتمال صدق و کذب کی وجہ سے فیصلہ نہ ہو سکتا ہو۔ ان میں سے پہلی قسم کے باب میں بھی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ جب کسی خبر کے پہنچنے کے ذرائع معتبر ہوں اور اس کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہ ہو تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ اور دوسری قسم میں بھی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ جب خبر کا ذریعۂ حصول مخدوش ہو یا اس کا نفس مضمون بداھۃً غلط معلوم ہوتا ہو تو اسے رد کر دینا چاہیئے۔ اب صرف تیسری قسم رہ جاتی ہے اور یہی خبر ہے جس کے باب میں علماء اسلام کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ اثبات احکام شرعیہ کے لیے کافی ہے یا نہیں۔

اس تقسیم کی رو سے یہ بات ضروری ہوئی کہ تحقیق اخبار کے لیے ایسے ذرائع اور اصول تلاش کیے جائیں جو نقلی و حسی ہوں تاکہ مخبر کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ معتبر ہے یا نہیں؟ اور اس کی خبر پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس راہ کا پہلا قدم اور سب سے اہم اصول راوی کا مسلم ہونا ہے۔ اس شرط کے اعتبار سے اہل شرک کی روایت قطعاً مردود ہے، جس پر کتاب و سنّت و اجماع امت شاہد عدل ہیں۔ دوسری شرط عقل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط ایسی ہے کہ اسی کی وجہ سے انسان احکامات شرعیہ کا مکلف ہوتا ہے۔ جہاں یہ شئ لطیف غائب ہے ساری ذمہ داری ختم۔ دیکھیے مجنون اور بچے کی روایت رفع القلم عن ثلاث الخ کی بنا پر محدثین کے نزدیک حجت نہیں۔ اسی وجہ سے بعضوں نے روایت کرنے کے لیے عمر کی قید لگائی اور ۵ برس تک کے بچے کی روایت قبول کی جیسے محمود بن الربیع۔ پھر اس میں یہ تفصیل کی گئی ہے کہ اگر

تحمل روایت بچپن میں ہوا اور ادا بلوغت میں تو ایسی روایت کے قبول پر سلف کا اجماع و اتفاق ہے[۱]۔ لیکن فقہا محدثین میں نووی و حازمی وغیرہ فرماتے ہیں:۔

قبول اخبار الصبی الممیز فیما طریقہ المشاھدۃ بخلاف ما طریقہ النقل کالافتاء و روایۃ الاخبار و نحوہ[۲]

باتمیز و سمجھدار بچے کی روایت ایسے واقعات کے متعلق معتبر ہے جو مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہوں لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں مثلاً فتوے یا حدیث کی روایت، ان میں بچوں کی روایت مقبول نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بحث بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ جس شخص کی عقل کسی امر خارجی کی بنا پر زائل ہو گئی ہو اس نے جو حدیث زوال عقل سے پہلے سنی اور وہ ممتاز بھی ہے تو وہ مقبول ہوگی۔ دوسری صورتوں میں توقف کیا جائیگا قبل اور بعد میں امتیاز کرنا راوی سے معلوم ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی طرح سے اس کے علم تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کی روایت کلیتہً رد کر دی جائے گی[۳]۔ تیسری شرط صدق ہے۔ یہ وہ عطیۂ ربانی ہے جس سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے بلکہ یہ وہ وصف عالی ہے جو انبیاء و اولیاء، ابرار و اخیار کا زیور ہے۔ پس جو اس سے عاری ہے اس کو آنحضرت صلعم کی بات میں یا دوسرے لوگوں کی باتیں جھوٹ ملا دینا نہ کوئی عیب نظر آئیگا نہ کوئی خوف دارین۔ لہذا اس کی روایت غیر معتبر ہے۔ چوتھا وصف عدالت ہے یعنی راوی کا عادل ہونا۔ اس لفظ کی لغوی و اصطلاحی تعریف پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ کوئی روایت معتبر نہ ہوگی جب تک کہ راوی میں صفت عدل نہ پائی جائے۔ اگر راوی عدل اور ضبط روایت میں کامل ہو جیسے شعبہ و سفیان اور یحیی القطان وغیرہ تھے تو اسکی روایت صحیح کہی جائیگی۔ اور اگر دونوں میں یا ایک میں کم ہے لیکن بہر حال عادل اور ضابط ہو تو اس کی روایت درجۂ حسن میں رکھی جائیگی۔ اس فرق کو سمجھ لینے کے بعد بہت سی فنی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں بقیہ دوسرے امور جو اس فن کے اندر بیان ہوئے ہیں وہ حقیقتاً انہی عناصر اربعہ کے اجزا ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقع پر آئیگا۔ (باقی)

---

[۱] ارشاد الفحول وغیرہ [۲] مقدمہ فتح الملہم [۳] شروط الائمۃ الخمسۃ وغیرہ۔

قطعِ یَد

(از جناب حافظ سراج الدین محمود صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی)

ایک صحبت میں میرے ایک دوست نے جو ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی اور صالح نوجوان ہیں دریافت فرمایا :۔

" کیا چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا بہت زیادہ سخت نہیں ہے ؟ بھوک اور فاقہ کشی سے مجبور ہو کر ایک آدمی اگر پیٹ بھرنے کے لیے اپنی خوراک کے قابل کچھ چرالے تو کیا اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جانا چاہیئے ؟"

رحم و کرم اور شفقت و محبت کے جذبات کا یہ اظہار اگرچہ ایک اجتہادی رنگ لیے ہوئے تھا مگر ان جذبات کی روح ہی نہیں بلکہ الفاظ تک علمائے سیاست و مصلحین فرنگ سے مستعار لیے ہوئے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو Victor Hugo نے انہی جذبات و احساسات کو اپنی مشہور عالم تصنیف مصیبت زدہ Les Misérables میں ایسے غمناک پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ قارئین کا اس سے متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکنات سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے فرنگ کا ایک طبقہ نیک نیتی سے یورپ کے اُن قوانین کی جو دورِ تاریک کی یادگار تھے، سختی و شدت کم کرنے میں ساعی رہا ہے۔ لیکن سیاسیئن مغرب کا ایک ایسا گروہ بھی وہاں ہمیشہ موجود رہا ہے جو کسی دیانت داری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی استعمار پرستانہ اغراض کے حصول کی خاطر ہر اسلامی نظریہ و قانون کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھے ہوئے ہے۔ کوئی موقع اور محل ایسا نہیں جہاں اس طبقہ کے افراد اپنی زہر چکانی سے باز رہتے ہوں۔ تاریخ کا مضمون ہو یا جغرافیہ کا، علم معشیت کا مسئلہ ہو یا معاشرت کا، نہایت ہی صفائی اور خوبصورتی

کے ساتھ اسلام کی مخالفت کر جانا اور تریاق میں زہر ملا کر دُنیا کے سامنے پیش کرنا، تاکہ اس زہر کو آسانی سے نوش کیا جاسکے، ان کا شیوہ ہوتا ہے۔

دشمنانِ اسلام تو اپنی فوقیت و برتری اور قوتِ استبداد کو قائم رکھنے کے لیے دانستہ دُنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے پر آمادہ و مستعد رہتے ہی ہیں۔ لیکن افسوس تو فرزندانِ اسلام پر ہے جو حقیقتِ حال کو سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت اپنے اعتراض کی اہمیت کو بھی قطعاً نہیں سمجھتے بلکہ "ہز ماسٹرز وائس" کی طرح جو سُنا ہے بس وہی بول دیا کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کے شکوک و شبہات خارجی اور فاسد اثرات کی پیداوار نہ ہوتے بلکہ ہماری اپنی ذہنی بلندی اور اُپج کا ہی نتیجہ ہوتے تو بھی بسا غنیمت تھا کہ اس صورت میں کم از کم یہ تو امید کی جاسکتی تھی کہ جب شئے لطیف موجود ہے تو جس طرح وہ شبہات پیدا کرتی ہے اسی طرح تھوڑی سی محنت اٹھا کر شبہات کا حل بھی نکال لے گی۔

اس قسم کے معترضین کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ اسلام ایک نظام ہے جو ایک خاص قسم کا تمدن اور مخصوص قسم کی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ اس نظام کی تمام کڑیاں مسلسل اور باہم مربوط ہیں۔ کسی ایک کڑی کو اس پورے نظام یا سلسلہ سے الگ کر کے مطالعہ کرنا حقیقتِ حال سے بے خبری اور جہالت کی دلیل ہے۔ ایسا کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا تھا کہ اسلام بھی بعض دوسرے مذاہب کی طرح چند غیر مربوط اخلاقی اصولوں کا مجموعہ ہوتا یا صرف مواعظ حسنہ کا ایک دفتر، جو عملی زندگی میں ہندوستان کے عقیدۂ اہنسا اور عیسائیت کے عقیدۂ مسکنت کی طرح ناممکن العمل ہوتا۔ مگر جب کہ اسلام ایک مرتب اور مربوط نظام ہے تو اس کے اجزا کو الگ الگ نہیں بلکہ پورے مجموعہ کے ساتھ دیکھنا ہی مشاہدۂ حقیقت کا صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔ قطع ید ہو یا کوئی اور حکم، آپ اس کو اس کے صحیح ماحول Proper environments میں مطالعہ کیجیے۔ آپ کے شکوک و شبہات خود دُور

ہو جائیں گے۔

قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ خیال کی وضاحت کی جائے اس سوال کی تحقیق کر لینی چاہیے، اور یہ ایک اہم سوال ہے کہ انسانی سوسائٹی میں آخر چوری ہوتی کیوں ہے؟ اس کے متعدد اسباب و وجوہ ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ مگر ان سب کو دو بڑی اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی چوری وہ ہے جو حاجت اصلیہ کے بغیر محض حرص، حسد، آسان طلبی، یا انتقام کے جذبات کے ماتحت کی جاتی ہے۔ اور دوسری قسم کی چوری وہ ہے جس کی محرک حقیقی حاجت مندی ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کی چوری کے متعلق تو ہم سمجھتے ہیں کہ شائد کوئی صاحب عقل آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس کے مرتکب کو کسی قسم کے رحم کا مستحق سمجھتا ہو، یا اس کے ساتھ نرم برتاؤ کی سفارش کرنا پسند کرے، کیونکہ اگر اس باب میں نرمی کی جائیگی اور اسے پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے گا تو ملک میں ظالم اور مظلوم دو ایسے طبقے پیدا ہو جائیں گے جن میں سے ایک طبقہ اپنے ظلم و جور اور طغیان و سرکشی سے دوسرے طبقہ کے لیے زندگی تنگ کر دیگا، اور جب دوسرا طبقہ اس ظلم سے تنگ آکر جواب میں ہاتھ اُٹھائیگا تو فساد، بدامنی اور خونریزی سے خدا کی زمین بھر جائے گی۔ ہاتھ کٹنے کی صورت میں تو دو چار کے ہاتھ کٹنے پر فتنہ فرد ہو سکتا تھا لیکن اب دو چار نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں کی گردنیں کٹنے پر بھی شر اور فساد کا سرچشمہ مشکل ہی سے بند ہو سکیگا لہذا ایسی چوری کے حق میں تو کوئی شخص رحم اور نرمی کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

اب صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے کہ افلاس و ناداری یعنی بھوک اور فاقہ کشی سے مجبور ہو کر جب محنت و مشقت کے باوجود بھی انسان اپنے اور اپنے بال بچوں کے سر چھپانے کو جگہ، تن ڈھانکنے کو کپڑا، اور پیٹ بھرنے کو روٹی نہ پا سکے تو لامحالہ اسے چوری جیسی ذلیل اور قبیح عادت کا سہارا لینا پڑے۔ خصوصاً جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ اور اس کے بال بچے تو فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، اور اسی کے مانند دوسرے انسان جو کسی طرح بھی اس سے بہتر و برتر نہیں، اس کی بہ نسبت کم محنت کر کے یا بالکل محنت نہ

کر کے بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، بلکہ خداوندی نعمتوں کو اسراف بے جا اور عیاشی میں اڑا رہے ہیں تو اس کا دل اپنی بے نتیجہ عرق ریزی و جفاکشی سے پھر جاتا ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جب میں سیدھے طریقہ سے اس غیر منصفانہ نظام کو ملیٹ نہیں سکتا تو کیوں نہ چوری کے ذریعہ سے تقسیم دولت کے اس فاسد نظام کو توڑ ڈالوں؟ جب دولت کا یہ دریا ہر پھر کر ایک ہی طبقہ میں بہے جا رہا ہے اور مجھ جیسے پیاسوں کو اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جاتا تو کیوں نہ میں خفیہ طریقہ سے یا زبردستی اس کے اندر سے ایک نالی اپنے لیے بھی نکال لاؤں؟

جو شخص اس ضرورت کی بنا پر مجبوراً چوری کرتا ہے، اس کا معاملہ یقیناً ہمدردانہ غور کا مستحق ہے۔ اگر اسلام نظام سرمایہ داری کی طرح تقسیم دولت کے اس ظالمانہ طور و طریق کو باقی رکھتا ہے اور پھر ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کے ساتھ اس نرمی کا سلوک بھی نہیں کرتا جسے نظام سرمایہ داری نے اختیار کیا ہے تو بلاشبہ اسے ظلم سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے کا سامان بھی نہ کرو اور جب وہ حاجت سے مجبور ہو کر چوری کریں تو ان کے ہاتھ بھی کاٹ دو، اسے کون نہ ظلم کہیگا۔ لیکن اگر اسلام انسان کی حاجاتِ اصلیہ کا سوال پہلے حل کرتا ہے اور پھر اس حل کو عملاً قائم کرنے کے بعد ان مفسدوں کے ہاتھ بیکار کر دینا چاہتا ہے جو اپنی حرص یا حسد یا آسان طلبی یا انتقام کی خاطر تقسیم دولت کے عادلانہ نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں، تو اس پر اعتراض کرنے والے کو زبان کھولنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ انسانیت کی دوستی میں زبان کھول رہا ہے یا دشمنی میں۔

اب قبل اس کے کہ ہم اسلام کے اس تجویز کردہ عمل سے بحث کریں ہمیں ایک نظریہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ سوسائٹی میں یہ غیر مساوی حالت اور غیر منصفانہ تقسیم کن وجوہ سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان وجوہ کے معلوم ہو جانے کے بعد ہمارے لیے اس حل کو سمجھ لینا نسبتاً زیادہ آسان ہو جائیگا۔

۱ انسانی سوسائٹی میں غیر مساوی حالت پیدا ہونے کی صرف تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ قلبی، ذہنی

اور جسمانی۔ ہم ان کی مزید تشریح کرتے ہیں:۔

قلبی وجہ:۔ یہ کہ عقیدۃً انسان ایسے طبقوں میں تقسیم ہو جائے جن میں سے بعض اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز اور اعلیٰ تصور کرتے ہوں اور بعض اپنے آپ کو حقیر اور ادنیٰ خیال کرتے ہوں۔ اس کی مثالیں ہندوستان میں خاصکر پائی جاتی ہیں۔ دیگر غیر اسلامی ممالک میں بھی دولت کی وجہ سے انسان کو اعلےٰ اور ادنےٰ طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حقیقی اسلامی روح کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے عملاً اسلامی طبقات بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہیں، اگرچہ عقیدۃً وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

ذہنی وجہ:۔ پیدائشی طور پر انسان اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے بعض انسانوں کے مقابلہ میں فائق تر ہوں اور اس بنا پر ان کے معاشرتی درجے اور مادّی حالات میں بھی تفاوت پایا جائے۔

جسمانی وجہ:۔ زیادہ اثر و رسوخ اور زیادہ قوت رکھنے والے لوگ دولت عامہ کی تقسیم اس طرح کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ان کو دوسروں سے بہت زیادہ حصہ ملے اور خاص حدود کے اندر عادلانہ تقسیم Equitable distribution of wealth نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے محروم و مفلس یعنی مزدور، اور دولتمند و سرمایہ دار طبقوں میں، یا وراثتی طور پر حاکم و محکوم طبقوں میں سوسائٹی تقسیم ہو جائے۔

اسلام نے ان مصائب کا جو علاج تجویز کیا وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) سب سے اوّل اسلام نے انسان کو اس کی اصلیت یاد دلائی۔ اس کی زندگی کی غرض و غایت اور مقصد کو کھول کر بیان کر دیا۔ اسے بتلایا کہ تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، یعنی تم میں نہ کوئی افضل اور اعلیٰ ہے اور نہ کوئی ادنےٰ اور حقیر۔ تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ اگر افضل ہیں تو سب کے سب ہی افضل ہیں، کیونکہ خداوند قدوس نے نوع انسانی کو نہ صرف اشرف المخلوقات ہی بنایا ہے بلکہ اس کو دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بھی بنا کر بھیجا ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً - اس لیے تم میں کوئی بھی ذلیل نہیں - لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ -

اسلامی سوسائٹی اسی بنیادی فکر کی اساس پر اٹھائی گئی ہے اور مسلمان جو اس فکر پر ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ - تم سب برابر کے بھائی ہو - تمہارے درمیان سے اونچ نیچ، چھوت چھات، بندگی و خواجگی اور پاکی و ناپاکی کے سارے فروق و امتیازات اٹھا دیے گئے - تم میں سے کوئی نیچ نہیں - سب اونچے ہیں - کوئی ناپاک نہیں - سب پاک ہیں - کوئی ادنیٰ اور حقیر نہیں - سب عزت والے اور شریف ہیں - تمہارے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو صرف اخلاق اور عمل صالح کے اعتبار سے ہے - اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ - اس اعتبار سے جو بڑھا ہوا ہے وہ بلاشبہ افضل ہے اور جو گھٹا ہوا ہے اس کا درجہ پست ہے، اگر یہ بلندی اور پستی اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ جو اس معنی میں بلند ہو وہ زیادہ زمین گھیرے یا دولت میں سے زیادہ حصہ پائے، بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ انسان کی نظر میں عزت اور بزرگی کا معیار مال یا نسب نہ ہو بلکہ حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل ہو -

یہاں مزید تفصیلات کی گنجائش نہیں - صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ اسلام نے اس طرح ان تمام تخیلات کی جڑ کاٹ دی جن پر انسانی سوسائٹی میں اونچے اور نیچے طبقات کا امتیاز قائم ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ایک طبقہ پیدائشی حق کے طور پر دوسرے طبقہ کو اپنی اغراض کا غلام بناتا ہے - قرنِ اوّل کی یہی وہ سب سے بڑی کامیابی تھی جس کی مثال تاریخِ عالم آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے - اسی تربیت سے وہ قوم پیدا ہوئی تھی جس کے ایک عام فرد کو جب رستم سپہ سالار ایران نے دربار ایران کی شان و شوکت، دولت و ثروت اور عزت و عظمت کے ہوش ربا نظارے سے دکھلا کر مرعوب و مبہوت کرنا چاہا تو اس پیوند لگے ہوئے لباس میں ملبوس اور پھٹے ہوئے نیام میں تلوار رکھنے والے سپاہی

کے پائے استقلال میں ذراسی لغزش بھی نہ آسکی۔ وہ سپہ سالار ایران کے جواہرات سے مرصع تخت پر اس کے پاس اس طرح بے تکلف جا بیٹھا جیسے کہ اس کی ساری عمر شاہی درباروں میں ہی گذری تھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر تخت سے نیچے اتار نے میں عجمیوں نے حماقت کی لیکن وہ اب فرش خداوندی پر بھی اسی بے تکلفی اور آن بان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ گویا مجمع کا سردار وہی ہے اور جب اس کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے :۔

"ہم میں یہ دستور نہیں کہ کوئی ایک ہم میں سے خدا بن کر بیٹھ جائے اور باقی اس کے سامنے اس کے بندوں کی طرح ہن کو ہاتھ باندھے کھڑے رہیں۔ ہمارا جو امیر ہے وہ ہمارے برابر ہی فرش زمین پر بیٹھتا ہے۔ اگر اسے ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا خیال آئے تو ہم اسے فوراً معزول کردیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ آقا و غلام نہیں ہیں"

تو اس انقلابی آواز کو سن کر ایرانیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں اور طبقاتی امتیازات سے کچلا ہوا ایران اسلامی جمہوریت کے اس مظاہرہ سے دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اس طرح اسلام نے طبقاتی فرق و امتیاز کے عقائد باطلہ کا بت عملی طور پر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ پھر جب ذہنی اور فکری قوتوں کو اس فتنہ سے نجات مل گئی اور انسان انسانیت کے رتبہ پر پھر سے فائز ہو گیا تو اسلام نے اس فکری آزادی کے حفظ و بقا اور انسان کی طبقاتی تقسیم کی قطعی بیخ کنی کرنے کے لیئے دوسرا قدم بڑھایا۔

(۲) دولتِ عامہ کی عادلانہ و منصفانہ تقسیم Just and equitable distribution of wealth قائم رکھنے کے لیے ایسے تمام کاروبار کی قطعی ممانعت کردی جس سے بلا زحمت دوسروں کی کمائی پر گھر بیٹھے قبضہ ہو سکے اور ہاتھ پاؤں تک بھی ہلانے نہ پڑیں۔ سود خواری، اجارہ، احتکار اور اکتناز اموال کا حرام قرار دیا جانا انسانیت کے لیے نعمت عظمٰے سے کم نہ تھا۔ وہ تمام ظالمانہ اور حریصانہ افعال یکدم بند کر دیے گئے جو صدیوں سے انسانوں

کا خون چوس رہے تھے۔ اب سوسائٹی میں کوئی ہشیار اور چالاک انسان، دھوکہ و فریب سے، بغیر کسی محنت و مشقت کے، دوسروں کی کمائی پر قبضہ نہیں کرسکتا تھا۔ اور دولت عامہ کی غیر منصفانہ تقسیم اس سوسائٹی میں اب ممکن نہ تھی۔

(۳) اس حکم سے ناجائز ذرائع آمدنی کو تو قطعاً بند کردیا گیا جائز ذرائع اور مناسب محنت و مشقت سے حاصل کردہ آمدنی کو مستحسن قرار دیا گیا مگر دولت کا چند افراد یا گروہوں کے پاس جمع ہو جانا پھر بھی سوسائٹی میں مفاسد اور فتن کے پیدا ہوجانے کا باعث ہوسکتا تھا۔ ہر جائز سے جائز اور ضروری سے ضروری چیز کا جب غلط استعمال کیا جائے تو اسی چیز سے پھر مفاسد پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔ اس لئے حد سے زیادہ دولت کا کسی ایک جگہ جمع ہوجانا اسلام نے گوارا نہیں کیا۔ اسی کے تدارک کے لیے زکواۃ فرض کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جائز محنت سے کمائی ہوئی دولت بظاہر انسان کی انفرادی محنت کا پھل ہوتی ہے اس لیے بادی النظر میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ جس نے اپنی محنت سے اس دولت کو کمایا ہے وہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے۔ لیکن اسلام اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا کہ کسی شخص کی کمائی ہوئی دولت محض اس کی انفرادی محنت کا ہی ثمر ہوتی ہے۔ برعکس اس کے اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص کی محنت کا بار آور ہونا ان تمام لوگوں کی مشترک محنتوں کا نتیجہ ہوتا ہے جن کے ساتھ اس کا معاشرتی و تمدنی رابطہ ہے۔ لہذا جن لوگوں کی محنتیں زیادہ بارآور ہوئی ہیں ان سے وہ ان لوگوں کا حق رکھوا لیتا ہے جن کی محنتیں کم بارآور ہوئیں یا بارآور نہ ہوسکیں اس حق کو وہ سوسائٹی کے مشترک خزانہ یعنی بیت المال میں جمع کراتا ہے اور خزانہ کے ناظموں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اُن طبقوں تک اسے پہنچائیں جو تقسیم دولت میں اپنا مناسب حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اس طریق تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبِ نصاب Haves اور نادار، Have-nots میں اتنا بعد المشرقین باقی نہ رہا جس سے ان میں کسی تصادم کا خطرہ پیدا ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ و

محنت کی جنگ سے اسلامی ممالک آج تک کبھی آشنا ہی نہیں ہوئے۔ چونکہ جائز حدود کے اندر انفرادی جدوجہد کو کلیتہً مسدود کرنا بھی خلاف فطرت ہے اور ساتھ ہی کسی ایک جگہ دولت کے انبار لگ جانا بھی فطری نظام تمدن کو خراب کر دینے کا موجب ہے، اس لیے اسلام نے نہایت ہی حکمت و دانائی کے ساتھ اس خطرہ کا سدِّباب بھی کر دیا اور انفرادی آزادی بھی برقرار رکھی۔ یہ حل فطرت سے اس قدر مطابق اور حکمتوں سے اس قدر پُر ہے کہ بے ساختہ زبان سے سُبْحَانَ اللّٰہِ العلی العظیم نکل جاتا ہے۔

(۳) وراثت کے باب میں دنیا کا عام نظریہ یہ تھا کہ جو دولت ایک مرتبہ ایک جگہ اکٹھی ہو چکی ہے وہ جمع کرنے والے کی وفات کے بعد بھی اکٹھی رہے۔ اسی غرض کے لیے اولاد اکبر کے حق Right of primogeniture کا اصول وضع کیا گیا، اور بعض جگہ اس میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ اگر مرنے والا اولاد نہیں رکھتا تو وہ کسی کو مُتبنّیٰ کر لے تاکہ اس کی جمع کی ہوئی دولت اور فراہم کی ہوئی جائداد ایک ہی جگہ بندھی کی بندھی رہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے بعض طبقوں کو مستقل طور پر وراثت کے حق سے محروم بھی کر دیا گیا، مثلاً عورتیں۔ یہ بھی دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کو برقرار رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اسلام نے اس حالت کو کُلّیتہً تبدیل کر کے رکھ دیا۔ نہ صرف تمام اولاد ذکور میں ہی باپ کے ترکہ کو تقسیم کیے جانے کا حکم صادر فرمایا بلکہ طبقہ اناث میں صرف بیٹیوں کو ہی نہیں بلکہ بیویوں تک کو بھی محروم نہ رکھا اور بہت سی صورتوں میں قریب و بعید عزیز و اقارب سب ذوی القربا کو بہرہ ور فرمایا۔ کمانے والے کو اپنی زندگی میں اپنی جائز کمائی سے بعد از ادائے زکوٰۃ و صدقات و مبرات، جائز حد تک ہر طرح مستفید ہونے کا حق ضرور دیا۔ لیکن اس کی موت پر باقی ماندہ دولت سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ زیادہ سے زیادہ وسیع کر دیا۔

(۴) اسلام نے اس سوسائٹی کے افراد کو زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت سب ہی

کی اجازت دے دی۔ لیکن ان سب کے لیے ایسے حدود مقرر کر دیے کہ کوئی شخص دوسروں کو نقصان پہنچا کر یا اپنی مناسب حد سے تجاوز کر کے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ ملازموں نے اپنی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے ہدیہ تک لینے سے احتراز کیا اور قبول ہدیہ کو بھی رشوت میں شمار کیا۔ قارض نے مقروض کی دیوار کے سایہ میں بیٹھنے تک کو سُود لینے کا ارتکاب تصوّر کیا۔ تجارت پیشہ نے اپنے مال کے نقائص خریدار کو دکھلائے بغیر مال فروخت کرنا ناجائز اور حرام خیال کیا۔ زراعت پیشہ نے دوسرے بھائی کے کھیت سے بلا اس کی اجازت گھاس تک کے کاٹنے کو چوری سے تعبیر کیا۔ پھر انصاف کے حصول میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مقدمات کے لیے بھی ایک پیسہ کا خرچ نہ تھا۔ کورٹ فیس، رشوت، بے جا رعب وداب، حاجب و دربان کی منتوں اور وکلاء کی قانون تراشیوں کا دروازہ بند تھا۔ اگر حکمرانِ وقت کے خلاف بھی چارہ جوئی کی ضرورت پیش آتی تھی تو غریب سے غریب مزدور کے لیے بھی کوئی روکاوٹ یا موانع موجود نہ تھے۔ امامت، نکاح خوانی، غمی یا خوشی کی تمام تقریبات انجام دینے کا ہر مسلمان اہل تھا اور ان کاموں کے لیے بھی کسی خاص طبقہ کے مخصوص حقوق تھے اور نہ ان کی انجام دہی کے سلسلہ میں کسی کی جیب پر کوئی بار پڑتا تھا۔ مرنے والوں کو قبر کے لیے زمین بھی مفت ملتی تھی اور اگر میّت کے ورثہ کفن فراہم کرنے کے قابل نہ ہوتے تو کفن بھی بیت المال سے بلاقیمت مل جاتا تھا۔

(۵) اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ حقوق ہمسایہ کو اس قدر وسعت دی گئی کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمسایہ کے اتنے حقوق بتائے گئے کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں اس کو ترکہ اور وراثت میں شریک نہ کر دیا جائے"۔ مسلمان سے کہا گیا کہ "تیرے لیے اس صورت میں کھانا حرام ہے جب کہ تیرا پڑوسی بھوکا ہو"۔ اس باب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی کوئی تمیز نہ کی گئی۔ قرآن کا حکم عام تھا کہ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ - نیک سلوک کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ پڑوسی کے ساتھ خواہ وہ قرابت دار ہو یا غیر، پاس بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ، مسافر کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جن کو خدا نے تمہارے بس میں کر دیا ہے۔

فلسفیانہ اور اخلاقی مجموعۂ قوانین کے لیے تو کسی قوتِ نافذہ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی کیونکہ اس قسم کے اختیاری فرائض کسی سوسائٹی کے تمام افراد کی عملی زندگی پر حاوی ہونے کے لیے وضع ہی نہیں کیے جاتے۔ ان کی حیثیت اختیاری امور کی سی ہوتی ہے۔ جو اشخاص انہیں پسند کریں ان پر عمل پیرا ہو دیکھیں ورنہ بصورتِ دیگر ان پر کوئی الزام نہیں۔ لیکن اسلامی قوانین کی یہ حیثیت نہ تھی۔ وہ اس دنیاوی زندگی میں ایک برتر و اعلیٰ سوسائٹی کی تخلیق و تنظیم کے لیے انسان پر فرض کیے گئے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کی پشت پر ایک ایسی قوت ہو جو راستہ سے تمام موانعات کو دور کر دینے اور احکام کو جاری کرنے کی طاقت و صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو۔ چنانچہ حقوق العباد یعنی انفرادی اور اجتماعی انسانی حقوق کو صحیح حدود کے اندر قائم رکھنے کے لیے اسلام نے نہ صرف قوانین دیوانی و فوجداری مرتب کیے بلکہ ان قوانین کے اجراء و عملدرآمد کے لیے ایک قوتِ نافذہ یا ہیئتِ حاکمہ بھی تشکیل کی جسے عرفِ عام میں حکومت اور اسلام کی زبان میں خلافتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس امارتِ اسلامیہ اور عام دنیاوی حکومتوں میں اتنا ہی فرق و امتیاز ہے جتنا کہ خدائی اور انسانی کاموں میں ہوا کرتا ہے۔ یہ خلافتِ اسلامیہ اگرچہ ہر عاقل و بالغ کے ووٹ پر منحصر نہیں تھی لیکن پھر بھی اس میں کسی ایک فردِ واحد کے حقوق کو خواہ وہ کتنا ہی غریب اور دور افتادہ کیوں نہ ہو، پامال کرنے کی قوت باقی نہیں رہنے دی گئی تھی۔ یہ حکومت اگرچہ موجودہ دور کی سی جمہوری حکومتوں کی مانند بھی نہ تھی لیکن

اس میں عوام الناس کے بالمقابل کسی ایک انسان کو بھی اپنی ذات کے لیے تفوق و امتیاز کے خاص حقوق حاصل نہ تھے۔ خلیفۃ اللہ یا امیرالمومنین اپنی رائے و منشاء سے اپنے ہر ایک اس فعل میں جو وہ ملّت کی بہبودی کے لیے سرانجام دینا چاہتا تھا مطلقاً آزاد و خود مختار تھا لیکن حدود اللہ سے ــــ جو نہایت ہی واضح اور بیّن طور پر بیان کر دی گئی تھیں اور جن میں وہ ایک ذرّہ بھر بھی کمی بیشی نہیں کر سکتا تھا ــــ بال بھر بھی اِدھر اُدھر ہونا اس کے لیے محال تھا تمام اسلامی افواج کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بیت المال کے تمام اموال و خزائن اُس کے قبضہ و اختیار میں ہوتے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کے احکام پر ہی نہیں اشارہ تک پر سرِ تسلیم خم کرنے کو اس حد تک تیار و آمادہ پایا جاتا تھا کہ دنیا بھر میں ایسی تسلیم و رضاء اور فدائیت کی مثالیں نہ پہلے کبھی تھیں اور نہ ہی بعد میں پائی گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ خود احکام خداوندی اور فرامین نبوی کی اطاعت میں سب سے آگے ہوتا تھا۔

قیصر و کسریٰ کے تمام خزائن بیت المال میں جمع ہیں لیکن یہ مختارِ مطلق دوا کے لیے بھی شہد کی ایک معمولی مقدار قوم کی اجازت کے بغیر اس میں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اُن قہار افواج کے مالک کے سامنے جن سے شرق و غرب کانپ رہا تھا، جن کی ایک ضرب کے سامنے قیصر ہرقل گھبرا کر "الوداع" اسے شام کہنے پر مجبور ہو گیا تھا، ایک بڑھیا کھڑی ہو کر کہہ دیتی ہے کہ مہر کی مقدار مقرر کرنے کے لیے آپ کا فتویٰ غلط ہے، اور وہ اپنا فتویٰ واپس لے لیتا ہے۔

یہ تو اس نظام حکومت میں مسلمانوں کی حیثیت تھی۔ لیکن رحمۃ للعالمین کے طفیل سے جو سوسائٹی عالمِ وجود میں آئی تھی اس میں غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو بھی وہ حقوق حاصل تھے جن کے متعلق دشمنوں کی شہادت موجود ہے کہ "غیر مسلم رعایا کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو اُن کو اپنی حکومت میں بھی حاصل ہونے ممکن نہیں تھے لیکن وہ صرف خلیفہ نہیں بن سکتے تھے"۔ ایک بوڑھے

اور ضعیف ذمی کا اس لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں اسکو دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ذلّت سے بچایا جائے۔ ایک عیسائی نے جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو ان الفاظ میں اپنے متعلق یاددہانی کرائی کہ "میں وہی عیسائی ہوں جو آج سے قبل فلاں وقت حاضر ہوا تھا" تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فوراً جواب میں فرمایا "میں وہی مسلمان ہوں جس نے تمہارے حسبِ منشا اسی وقت احکام نافذ کر دیئے تھے"۔ ان سب سے بڑھ کر وہ واقعہ ہے کہ جب ایک بدبخت آتش پرست غلام نے حضرت فاروق اعظمؓ کو شہید کر دیا اور ابنِ عمرؓ نے شدّتِ رنج والم سے مغلوب ہو کر اس مجوسی کو قتل کر ڈالا، تو صحابۂ کرام نے ایسے سخت اور غیر معمولی جوشِ قومی کے موقع پر بھی عدل کو فراموش نہ کیا، اور نئے خلیفہ کے سامنے سب سے پہلا سوال یہی پیش کیا کہ خلیفۂ شہید کے بیٹے نے چونکہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر باپ کے قاتل سے خود انتقام لیا ہے اس لیے اس سے قصاص لیا جانا چاہیئے۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور وہ حق پر بھی تھے لیکن پھر بھی ان کو بیت المال سے مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہی پڑی۔ غور تو کیجیے۔ اس بیسویں صدی میں بھی حاکم قوم کے ایک معمولی فرد کو قتل کر دینے پر پوری قوم آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور قاتل کی پوری قوم پر عذاب نازل کر دیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کی شانِ عدل دیکھیے کہ خلیفۂ وقت اور ملّتِ اسلامی کا نامور ترین ہیرو مار ڈالا جاتا ہے اور پھر بھی پیروانِ اسلام عدل وانصاف کو نہیں بھولتے قاتل کی قوم تو رہی درکنار، خود قاتل سے بھی غیر قانونی انتقام لینے کو جائز نہیں رکھتے۔

عرب کے مفلس وقلّاش بدّو شاہانِ ایران کے محلات میں داخل ہوتے ہیں اور آلِ ساسان کے صدیوں کے جمع شدہ اموال وخزائن، زروجواہر اور دولت کے انبار ان کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں مگر ایک سوئی سے لے کر زروجواہر سے مرصّع طلائی اونٹنی تک صحنِ محل میں بجنسہٖ لاکر جمع کر دی جاتی ہے

اب اس تمام بیان کو ایک بار پھر پڑھو! ایک ایسی سوسائٹی جس میں جُوا، سٹہ، اجارہ، احتکار، بیع غرر، سُود اور دوسرے تمام دھوکہ و فریب سے کیے جانے والے کاروبار حرام کر دیے گئے ہوں، جس میں عزیز و اقارب، رشتہ دار و ہمسایہ اور قریب و بعید ہر ایک کے حقوق کی حفاظت کر دی گئی ہو، جس میں دولتِ عامہ کی تقسیم کو صحیح اور مناسب حدود کے اندر رکھ کر کسی ایک جگہ دولت کے انبار جمع ہو جانے کے امکان کا بھی سدِ باب کر دیا گیا ہو، جس میں حکومت سید القوم خادمہم کے اصول پر اس حد تک عمل پیرا ہو کہ لباس، خوراک، رہائش اور آسائش سبھی چیزوں کے لحاظ سے حکمرانِ وقت کی نسبت عام رعایا کو زیادہ خوشحالی، فارغ البالی اور سہولتیں نصیب ہوں، جس میں انصاف مفت، تعلیم مفت، نکاح و طلاق مفت، تجہیز و تکفین مفت، غرض خدمت عمومی کے تمام کام مفت ہوں، جس میں حاجت مند کی ہر حاجت کا کفیل بیت المال ہو، جس میں عامۃ الناس کی اخلاقی تربیت اتنے بلند پیمانہ پر کی گئی ہو جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، کیا ایسی سوسائٹی میں چوروں اور سارقوں کے لیے کوئی جگہ باقی رہ گئی تھی؟ آپ مذکورۂ صدر حالات پر قطعاً خالی الذہن ہو کر غور فرمائیں اور اگر پوری دیانتداری سے غور و خوض کے بعد بھی آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں کہ اس سوسائٹی میں بھی کسی ایک انسان کے چوری پر حقیقتہً مجبور ہونے کا کوئی امکان تھا تو پھر ہم اپنی رائے پر اصرار نہ کریں گے۔ لیکن اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور حقیقتاً اس کا جواب ہے ہی نفی میں، تو پھر آپ خود ہی فرمائیے کہ کیا ایسی سوسائٹی میں سرقہ یا چوری جیسے فعل قبیح کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ کوئی نرمی برتی جا سکتی تھی؟ کیا وہ لوگ بدترین قسم کے مفسد نہ ہوں گے جو ایسے عادلانہ نظام اجتماعی میں رہ کر بھی چوری سے باز نہ آئیں؟ کیا ایسی سوسائٹی میں چوری کرنے والا خود اس بات کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتا کہ وہ حاجت سے مجبور ہو کر چور نہیں بنا ہے بلکہ بچھو کی طرح اس کی طینت ہی ناپاک ہے؟ پھر اگر بچھو کے لیے سر کچلنے کی سزا سخت نہیں تو اس بڑے اور زیادہ خطرناک اجتماعی بچھو کے لیے

۱؎ اجناس کو جمع کر کے روک رکھنا تاکہ قیمتیں گراں ہو جائیں اور ان کو فروخت کر کے نفع کمایا جائے۔
۲؎ وہ بیع جس میں خریدار کو کسی قسم کا دھوکا دیا جائے۔

قطع ید کی سزا کیوں سخت ہو؟

علم النفس کا یہ ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ فطرت کی سختی و شدّت کو انسان گھٹا نہیں سکتا۔ البتہ اسے متعدد جگہ تقسیم کر دے سکتا ہے۔ اسلامی تعزیری قوانین کو غلطی سے انسان نے آج کل سخت تصور لیا ہے مگر وہ ان کی مزعومہ شدّت کو کم تو نہیں کر سکا البتہ اپنی حماقت سے اس کو متعدد جگہ تقسیم کر کے بنی نوع انسان کو عام طور پر مبتلائے آلام و مصائب ضرور کر دیا ہے اگرچہ ظاہر میں ہر ایک کی تکلیف کی مقدار کم نظر آتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے انسانیت کی روح اس شدت کو یقیناً بہت بری طرح محسوس کر رہی ہے۔ جہالت جدیدہ نے اسلامی تعزیرات کو سخت تصور کیا اور جرائم کے لئے ہلکی سزائیں تجویز کیں۔ لیکن ان ہلکی سزاؤں کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ شرارت پسند عناصر نے ان کو درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھا اور جرائم اور مجرموں کی تعداد روز افزوں ہوتی چلی گئی۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بعض پیشہ ور مجرم اور شدید ترین قسم کے سارق جیل سے رہا ہوتے وقت حکام جیل سے کہہ آتے ہیں کہ ہمارا پیالہ اور کمبل سنبھال کر رکھنا، ہم عنقریب واپس آئے؟ قطع ید کی سزا اگر محض معدودے چند آدمیوں کو دے دی جاتی تو بہت سے انسان چوری کے جرم اور اس کے مادّی و اخلاقی نقصانات، اور جیل کی بدترین زندگی سے بچ جاتے اور ہماری معاشرت میں اس بدترین ادارہ کو زیادہ نشو و نما کا موقع نہ ملتا جسے "جیل خانہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس میں بہت سے مختلف قسم کے مجرم مل کر مجرمانہ زندگی کے لیے ایک دوسرے کی تربیت کرتے ہیں۔ چند مجرموں کو اس طرح سختی سے بچا لیا گیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے لاتعداد انسانوں کو جرائم کی ترغیب ہوئی اور نرالے جرائم کا ارتکاب کرنے کی تدبیریں بھی وہ ایک دوسرے سے سیکھ گئے، اور جیل کی زندگی سے مانوس بھی ہوتے گئے۔ اس پر مزید یہ کہ سوسائٹی کو جرائم کے اس مدرسہ کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دار و گیر اور پکڑ دھکڑ کے لیئے زائد پولیس۔ عدل و انصاف کے لیے مزید عدالتیں، مجرموں کے

قیام وطعام اور ان کی نگرانی کے لیے بہت بڑے اسٹاف کے مصارف اور ان سب کے ساتھ کثرت جرائم کی وجہ سے جو ذہنی پریشانی قوم کو لاحق رہی اس کا نہ کوئی حساب لگایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی قیمت مشخص کی جاسکتی ہے۔

پھر کیا تہذیب جدید کی پیدا کردہ سوسائٹی آج کل شدید سزاؤں سے ہر معاملہ میں اجتناب کر رہی ہے؟ قطعاً نہیں۔ جرمنی اور بعض دوسرے ممالک میں تہذیب اور قوم کے نام پر موروثی امراض کے مریضوں اور ناکارہ افراد کے لیے آج جو قانون نافذ ہے کیا وہ قطع ید کی سزا سے کم سخت ہے؟ اس کا نام Eugenics "تولید نسل صالح" رکھ دیجیئے اور اس مہذب نام سے لوگوں کے صنفی اعضا کی کانٹ چھانٹ کیجیے تو کوئی عیب نہیں۔ لیکن تولید جماعت صالحہ کے لیے یہی قطع اعضا کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ عیب ہے اور اس کو وحشت اور بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے! یہ اگر بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تہذیب کے دور میں سزا سے انتقام مقصود نہیں ہے بلکہ اصلاح اور تبدیلیٔ قلب مقصود ہے، لہذا مہذب ممالک کے جیل خانوں میں سخت سزاؤں کی بہ نسبت مجرم کی اصلاح پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تاکہ مجرم ان جیل خانوں سے بہتر شہری اور زیادہ دیانت دار انسان بن کر نکلیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور مغرب زدہ انسانوں کی فطرت اُلٹی واقع ہوئی ہے۔ وہ دُکھ درد کی پکار پر اس وقت تک کان نہیں دھرتے جب تک کہ انسان اپنے ساتھ خود ان کو بھی لے مرنے کی نہ ٹھان لے جب علاج کا وقت ہوتا ہے تو یہ مجرمانہ غفلت اور بے پروائی سے کام لیتے ہیں، اور جب پانی سر سے گذر جاتا ہے تو پھر علاج کی فکر کرتے ہیں۔ ان کی یہ حالت صرف سیاست ہی میں نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسی پر اُن کا عمل ہے۔ مجرموں کی اصلاح کی کوشش

اسلام سے زیادہ اور کون کرے گا؟ لیکن صحیح اصلاح کا وقت وہ نہیں ہوتا جب مجرم جرم کا ارتکاب کر کے سزا کا مستحق ہو چکا ہو، بلکہ اس کا صحیح وقت بطنِ مادر سے نکلنے کے بعد اور جیل میں داخل ہونے سے پہلے ہے۔ افرادِ قوم کی اخلاقی اور ذہنی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی برائیاں دب جائیں اور بھلائیاں چمک اُٹھیں۔ سوسائٹی کا نظام ایسا بنایا جائے کہ اس میں کسی کو اپنی حقیقی ضروریات کے لیے جرم کرنا ہی نہ پڑے۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ اس وقت سے مجرم کی اصلاح کا طالب ہوتا ہے جب کہ اس نے ابھی آغوشِ مادر میں آنکھیں ہی کھولی ہوں۔ وہ قرآن اور سنّتِ رسول کے ذریعہ سے اس کو بہترین اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے ساتھ اجتماعی زندگی میں خرابی کے تمام اسباب و علل کی چھان بین کر کے ایسی فضا پیدا کر دینا چاہتا ہے کہ اس میں جرائم کا نشو و نما ہی نہ ہو سکے۔ اس طرح ارتکابِ جرم اور گرفتاری سے پہلے وہ اصلاح کی تمام تدبیریں پوری کر لیتا ہے۔ پھر جب ان سب کے باوجود جرم کا ارتکاب ہو جائے تو اس صورت میں اسلام کو اس فردِ واحد کی اصلاح کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی ان دوسرے بہت سے افراد کو جنہوں نے ابھی جرم نہیں کیا ہے، ارتکابِ جرم سے بچانے کی فکر ہوتی ہے۔ جس طرح تولیدِ نسلِ صالح کا حامی Eugenist کہتا ہے کہ موروثی بیماریاں اور دماغی و اخلاقی خرابیاں جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں اُنہیں خصی کر دو تاکہ ان کی خرابی دوسروں میں منتقل نہ ہو، اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ جو شخص چوری اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اس پر ایسا آپریشن کرو کہ سوسائٹی کے دوسرے افراد، جن میں ایسے ہی جرائم کی استعداد پوشیدہ ہے، اس جرم کی چھوت لگنے سے بچ جائیں۔

مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ یہ آپریشن کرنے کے بعد اسلام اُس شخص کی اصلاحِ حال سے غافل ہو جاتا ہے جس پر آپریشن کیا گیا ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا چور اور چورٹی دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ

أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

بدلہ ہے ان کے اس کرتوت کا۔ یہ تعزیر ان کے حق میں خدا کی طرف سے قرار پائی ہے اور خدا زبردست حکمت والا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اخلاقی حالت سنوار لے تو اللہ بھی رحمت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جرم کیا اور اس کی سزا بھی مل گئی۔ اب اگر آئندہ کے لیے ارتکاب جرائم سے باز آجائے اور اپنی حالت درست کرلے تو اس کو دوبارہ عزت کا مقام مل سکتا ہے۔ مزید برآں اسلام نے مجرم کی اس اصلاح کا بار تنہا اس کی اپنی ذات پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی جائز امداد کے لیے خلافت الٰہیہ ہمہ جاب تک اس کی مادی و اخلاقی فلاح و بہبود اور اصلاح کی ضامن تھی آمادہ و مستعد رہے گی۔

مغرب کے تمام مہذب ممالک میں تہذیب جدید کے پیدا کردہ نئی قسم کے اصلاحی جیل خانے قائم ہیں۔ تمام سائنٹفک ایجادات اور علوم و فنون کے اشتراک عمل سے انسداد جرائم کے لیے سب کچھ کیا جارہا ہے۔ لیکن نتائج اس قدر حیرتناک ہیں کہ خود مغرب کے دُوربیں اور دور اندیش انسان کثرت جرائم پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ہم اس موضوع پر بہت کچھ خامہ فرسائی کرسکتے ہیں لیکن یہاں صرف ایک بیان پر ہی اکتفا کریں گے۔

کرنل لنڈبرگ مشہور دولتمند امریکی ہوا باز ہے۔ بڑی منتوں اور آرزوؤں کے بعد اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جو ماں باپ کو اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔ مہذب ملک امریکہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ مجرموں نے لنڈبرگ کی دولت میں سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہا اس لیے انہوں نے اس بچے کو چرا لیا، اور اپنی قوم کے اس نامور ہیرو کو مطلع کردیا کہ فلاں وقت اور فلاں جگہ اتنی

رقم بھجوا دو تو تمہارا لڑکا تمہیں زندہ و سلامت واپس مل جائے گا ورنہ اس کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ مہذب اور متمدن امریکی حکومت نے ان مجرموں کو گرفتار کرنے اور بیچارے کرنل کو اس جبری جرمانے سے بچانے کے لیے سارے ہی جتن کر ڈالے۔ لیکن وہ کرنل صاحب کو ان کا لڑکا واپس نہ دلا سکی۔ یہاں تک کہ اس معصوم بچہ کے خون سے غالباً ان ظالموں نے ہاتھ رنگ ہی لیے۔ اب وہ بیچارہ غریب اس مجرم گروہ کی دراز دستیوں کے خوف سے بارہ مہینے یورپ کے مختلف ممالک کی خاک چھانتا پھر رہا ہے تاکہ اپنے دوسرے بچے کی جان بچا سکے۔ اُسے کسی ایک جگہ قرار نہیں کبھی کسی ملک میں اور کبھی کسی ملک میں چھپنے اور پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے جیسے ایک خرگوش شکاری کتوں سے بچنے کے لیے ہر جھاڑی اور ہر درخت کی آڑ تلاش کیا کرتا ہے۔ یہ وہی ہوا باز کرنل ہے جو ہوا بازی کا ریکارڈ قائم کرنے کی وجہ سے امریکن پبلک میں بہت ہر دلعزیز ہو چکا ہے۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس مہذب ملک میں جب اتنے بڑے آدمیوں کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا ہے تو نسبتاً کم درجہ کے لوگوں پر کیا گذرتی ہو گی۔

اب اسلامی حکومت کا حال دیکھیے۔ اسلام کی اصلی حکومت قرن اوّل کے تیس سال تک رہی اور یہی وہ مبارک زمانہ تھا جس میں اسلامی قانون اپنے تمام جزئیات کے ساتھ نافذ ہوا۔ اس دور میں اسلام کے قوانین کو عمل میں لاکر اور خالص اسلامی اصول پر سوسائٹی کا نظام مرتب کرکے دنیا کو دکھا دیا گیا تاکہ بعد میں یہ سوال ہی نہ اُٹھ سکے کہ ان قوانین پر عمل بھی ممکن ہے یا نہیں؟

اس حکومت کو انتظام مملکت کے لیے وہ زبردست ذرائع حاصل نہ تھے جو آج بیسویں صدی کی ترقی یافتہ حکومتوں کو حاصل ہیں۔ نہ ٹیلیفون۔ نہ تار۔ نہ بے تار برقی۔ نہ موٹر۔ نہ ریل۔ نہ ہوائی جہاز نہ سراغرسانی کے جدید فنون۔ مگر اس کے باوجود اس کی قلمرو میں جہاں دو دو سو میل تک پولیس کی ایک چوکی بھی نہ ہوتی تھی، مجرموں کے منظم جتھوں کا کہیں نشان نظر نہیں آتا۔ لوٹ مار، ڈاکہ زنی،

سرقہ اور نقب زنی کے واقعات شاذ و نادر کہیں پائے جاتے ہیں۔ یمن سے لے کر عراق تک ریگستان عرب میں ایک عورت تنہا چلی جاتی ہے اور کوئی اس سے تعرض کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس حیرت انگیز امن و امان کے مقابلہ میں یورپ اور امریکہ کی موجودہ بدامنی کو دیکھیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ امن قائم کرنا اسلامی قانون کا طرۂ امتیاز ہے یا مغربی قوانین کا؟

قرن اوّل کو چھوڑیے۔ آج نجد و حجاز میں اسلامی حکومت کا محض ایک دھندلا سا خاکہ ہی قائم ہے۔ صدیقؓ و فاروقؓ کے عہد کی سی سوسائٹی موجود نہیں ہے مگر اسلامی تعزیرات ضرور نافذ ہوتے ہیں۔ ان کی برکت دیکھیے کہ ریگستان میں پڑی ہوئی اشرفی کو ایک بدّو ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ لاکھوں روپے کا خزانہ یونہی اونٹوں پہ لاد کر ساربانوں کے ہاتھ ریاض سے کویت تک چلا جاتا ہے۔ کوئی پولیس اور فوج ساتھ نہیں ہوتی۔ مگر کیا مجال جو کوئی خزانہ کے اونٹوں کو چھیڑ بھی سکے۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اسلامی تعزیرات کے فائق و برتر ہونے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے باوجود اگر مسلمان اسلامی قوانین پر یورپ کے جاہلانہ اعتراضات کو سن کر گھبرائیں اور یہ کہتے ہوئے شرمائیں کہ ہمارے قانون میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو اس کو غلامانہ ذہنیت کے سوا کسی دوسری چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا دماغ یورپ کا غلام نہیں ہے اس کو تو جرأت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ دنیا میں حقیقی امن اسلام اور صرف اسلام ہی کے قانون سے قائم ہو سکتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ صرف اس قانون کے صحیح ماحول Proper environments کی وضاحت تھی۔ اسلامی شرعی احکام سارق کے بارے میں اس وقت تک بیان نہیں کیے گئے۔ ہم نے اسلامی قانون کی عقلی و علمی بنیادوں پر بحث کرنے میں جو اس قدر وقت صرف کیا اس کی وجہ محض یہ ہے کہ لوگ عموماً اس پہلو سے خالی الذہن ہیں اور ان کو صحیح فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے اتنی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے ورنہ ہم کسی اندرونی احا

دونائت (INFERIORITY COMPLEX) میں مبتلا نہیں ہیں کہ ان تشریحات کے بغیر یہ اعلان کرنے کی جرأت نہ کر سکتے ہوں کہ ہاں اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اگر ہم اس بیماری میں مبتلا ہوتے تو حقیقت کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے گناہگاروں کی طرح صفائی پیش کرنے کا طریقہ Apologetic attitude اختیار کرتے جیسا کہ اپنی کمزوریٔ ایمان کی وجہ سے ہر میدان میں اس وقت مسلمان اختیار کر رہے ہیں۔

اب مختصراً اہم سرقہ کے متعلق اسلامی قانون کی تفصیلات بھی بیان کیے دیتے ہیں۔

(۱) قطع ید کی سزا کے لیے عاقل اور بالغ کی شرط ہے۔ غیر عاقل اور نابالغ کے لیے یہ سزا نہیں ہے (بالاجماع)

(۲) ایک مقررہ مالِ نصاب سے کم پر یہ سزا نہیں ہے اور نصاب سرقہ کی مقدار میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

(۳) نصابِ سرقہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دس درہم، امام شافعیؒ کے نزدیک رُبع دینار، اور امام مالکؒ کے نزدیک تین درہم ہے۔

(۴) ایک نصابِ سرقہ میں اگر کئی آدمی شامل ہوں تو کسی کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ امام مالکؒ کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

(۵) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان چیزوں میں قطع ید کی سزا نہیں ہے: گھاس، لکڑی، بانس، مچھلی، پرندے، شکار، مٹی، چونا، کھانے پینے کی چیزیں، روٹی، دودھ، گوشت، ترمیوہ، درختوں پر لگے ہوئے پھل، اشربہ وغیرہ۔

استدراک

(از ایڈیٹر)

۱- حدودِ اسلامی کے باب میں سب سے پہلے اس قاعدہ کلیہ کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ حدود صرف اسی جگہ نافذ کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابلِ تجزیہ ہیں۔ یعنی یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کیے جائیں اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ مثلاً زنا اور قذف کی حدود کو لیجیے کہ نکاح و طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاق صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے اِن حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے زانی اور قاذف کے لیے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لیے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابانہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں، عشق و محبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لیے پوری آسانیاں ہوں اور فسخ و تفریق، طلاق و خلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کیے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی ہی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لیے سخت سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور اتنی سخت سزائیں اُس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جب کہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کر دی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسبابِ تحریک سے پاک کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور

جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لیے نہایت عبرتناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔ لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جوان مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو، جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور تعلق ازدواجی کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں جہاں معیار اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں ایک معمولی قسم (Normal type) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ان حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (Abnormal type) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لیے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔ اسی پر حدِ سرقہ کو بھی قیاس کر لیجیے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لیے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظم معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظم معیشت قائم ہو وہاں قطع ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظم معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا اس ظالم سوسائٹی کے لیے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو، زکوٰۃ متروک ہو، انصاف قیمتاً فروخت کیا جاتا ہو، ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہو گئی ہوں اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لیے سامان عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لیے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانون فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دُنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے، اور پھر چوری، زنا، قذف اور شرب خمر جیسے "عامۃ الورود" جرائم کا موازنہ قطع ید، رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کر کے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی۔ کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اِس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہیے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہیے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بُری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں۔ بُری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بُری عادتیں پڑنی ہی چاہئیں۔ لہٰذا ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانون فوجداری رائج کر دیا جائے تو شاذ کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے، ہزارہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں، اور ہر روز سینکڑوں آدمی سنگسار کیے جائیں۔ بلاشبہ اُن کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بیہودہ سوسائٹی کے بیہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اس کے قانون فوجداری کو نافذ کر دینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہو گا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بیہودہ نظام کو، جس کی بیہودگیوں سے وہ مانوس ہو چکے ہیں، ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے، حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے بلکہ شیطنت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالم انسانی پر مسلّط کر دیا ہے، اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلم عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظام اجتماعی کو من حیث الکل قبول کر کے اس ظلم کا انسداد کیجیے پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری مشاغل نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع ہی نہیں ہے۔ جو اجتماعی

حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعال قبیحہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور ان کے لیے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطع ید ہی ہو سکتے ہیں۔

۲- دوسری بات جو اس سلسلہ میں پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے وہ اسلام کی شانِ حکمت و اعتدال ہے۔ حدود اور تعزیرات کے باب میں اسلام کے احکام کو وہ شخص سمجھ ہی نہیں سکتا جو اس مذہب کی ان خصوصیات سے واقف نہ ہو۔ یہاں ایک طرف تو ارتکاب جرائم کے اسباب و محرکات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مٹایا جاتا ہے تاکہ کوئی بندۂ خدا ایسے حالات میں مبتلا ہی نہ ہونے پائے کہ اسے اپنی طبعی خواہشات و ضروریات کے لیے مجرمانہ طریقے استعمال کرنے پڑیں۔ دوسری طرف جرائم کے لیے ایسی سزائیں مقرر کی جاتی ہیں جو نہ صرف اعادۂ جرم سے اس خاص شخص کو روک دینے والی ہوں، بلکہ دوسرے تمام لوگوں کو بھی جن میں مجرمانہ میلانات پائے جاتے ہوں، ہیبت زدہ کر دیں۔ ایک طرف اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ جہاں تک ممکن ہو سزا سے بچائے جائیں۔ چنانچہ ثبوتِ جرم کے لیے شہادت کا معیار بہت سخت رکھا جاتا ہے۔ اجرائے حد سے پہلے کچھ مدت تحقیقات کے لیے معین کی جاتی ہے کہ شاید اس دوران میں گواہوں کی غلطی کھل جائے۔ قاضیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ لوگوں کو حتی الامکان سزا سے بچاؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ادرؤا الحدود ما استطعتم "اپنے امکان بھر حد کو دفع کرو"۔ فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبۃ۔ "امام کا معاف کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے"۔ دوسری طرف جب جرم ثابت ہو جائے تو مجرم پر ترس کھانا یا اس کے حق میں کسی قسم کی سفارش قبول کرنا، یا اس کے مرتبے اور خاندان وغیرہ کا لحاظ کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ قرآن کہتا ہے وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور-۱) "اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملہ میں رحم اور شفقت کے جذبات

تمہارے دامن گیر نہ ہونے چاہئیں"۔ حدیث میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ بنی مخزوم کے معزز گھرانے کی ایک عورت فاطمہ لوگوں کے زیور اور سامان عاریۃً منگواتی اور پھر مکر جایا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا اور جرم ثابت ہو گیا۔ قریش میں کھلبلی مچ گئی کہ کہیں اس کا بھی ہاتھ نہ کاٹ ڈالا جائے۔ مگر حضورؐ کے سامنے سفارش کی جرأت کسے تھی۔ آخر کار مشورہ یہ ہوا کہ اُسامہ سے جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے بیٹے تھے، سفارش کرائی جائے، کیونکہ حضورؐ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اُسامہ نے حاضر ہو کر سفارش کی۔ سُنتے ہی آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور فرمایا "کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟" اُسامہ سہم گئے اور معافی مانگی۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئی ہیں اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جب اُن میں کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی ادنےٰ درجہ کا آدمی جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ میں خُدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹے بغیر نہ چھوڑتا"۔

۴ - ان سب چیزوں سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ آدمی اسلام کی روح کو سمجھ لے، اس لیے کہ یہی تمام قوانین اسلامی کی جان ہے۔ اسلام میں سزا کا تصوّر خیر خواہانہ ہے نہ کہ بدخواہانہ۔ اسلام کسی کو غصّہ اور طیش میں نہیں مارتا، اور نہ دشمنی کا جذبہ اس کے کسی قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہاں سزا کے اندر "تطہیر" کا داعیہ کارفرما ہے۔ یہاں آدمی کو اس لیے سزا دی جاتی ہے کہ ارتکاب جرم سے اس کے نفس و روح کو جو نجاست لگ گئی ہے اُسے دھو ڈالا جائے۔ اسے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ خود مجرم کے اندر اسلام یہ اعتقاد پیدا کرتا ہے کہ اصلی حاکم خدا ہے جس سے تُو اپنے کسی فعل کو نہیں چھپا سکتا۔ اور اصلی عدالت آخرت کی عدالت ہے جس میں بہرحال تجھے پیش ہونا ہی پڑے گا اور وہاں کی سزا بڑی رُسوا کن ہو گی۔ اگر تُو نے دنیا میں اپنا جرم چھپا لیا تو اسی گندگی کو

بنے ہوئے تو خدا کی عدالت میں حاضر ہوگا۔ لیکن اگر تو نے یہاں خود اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کر دیا تو یہ سزا تجھے پاک کر دے گی اور تو اس طرح خدا کے ہاں پہنچیگا کہ گویا تو نے یہ جرم کیا ہی نہ تھا۔ حدیث میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

ان من اصاب من هذه المعاصی شیأ فعوقب به فی الدنیا فهو کفارة له ومن اصاب منها شیأ فستره الله فهو الی الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه	ان گناہوں میں سے کسی گناہ کی نجاست اگر کسی کو لگ گئی اور دنیا ہی میں اس کی سزا بھی اسے دے دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر اللہ کی حکمت سے اس کا گناہ چھپا رہ گیا تو معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ وہ چاہے گا تو معاف کر دے گا ورنہ سزا دے گا۔

اس تعلیم نے جو حیرت انگیز اخلاقی احساس ہمارے ہی جیسے گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں میں پیدا کر دیا اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ان مثالوں میں آپ کو اسلامی عدل، اسلامی اخلاق اور اسلام کے عجیب و غریب انقلابی تصورات کی وہ شان نظر آئے گی کہ آپ شاید حیرت سے سوچنے لگیں گے کہ آدمی اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے!

ایک مرتبہ ایک چور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے ایک شملہ چرایا تھا۔ آپ نے اُسے دیکھ کر فرمایا "میں نہیں سمجھتا کہ اس نے چوری کی ہو گی"۔ ملزم نے آگے بڑھ کر عرض کیا "نہیں، یا رسول اللہ! میں نے چوری کی ہے"۔ آپ نے اس کے اقرار کو قبول کر کے حکم دیا کہ "جاؤ اس کا ہاتھ کاٹو، پھر میرے پاس حاضر کرو"۔ چنانچہ ہاتھ کاٹنے کے بعد اُسے دوبارہ حاضر خدمت کیا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا "اب اللہ سے توبہ کر"۔ اس نے کہا "میں نے توبہ کی"۔ آپؐ نے فرمایا "جا اللہ نے تیری توبہ قبول کر لی"۔

ایک اور موقع پر ایک شخص (عمر بن سمرہ) نے حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ " میں نے فلاں قبیلہ کا ایک اونٹ چرا لیا ہے۔ آپ مجھے پاک کر دیں"۔ حضور نے اُس قبیلہ میں آدمی بھیج کر حقیقت حال دریافت کرائی۔ معلوم ہوا کہ فی الواقع ان کا اونٹ غائب ہے۔ اس پر آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ جب سزا اس پر نافذ کی گئی تو اس نے کہا " شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے پاک کر دیا"۔ پھر اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو مخاطب کر کے کہتا ہے " تُو مجھے دوزخ میں لے جانا چاہتا تھا۔ اللہ نے مجھے تجھ سے بچا لیا"۔

اوپر بنی مخزوم کی جس عورت کا قصّہ مذکور ہوا ہے اس کے مقدمہ کا جب حضور نے فیصلہ سنایا تو اُس کی قوم نے کہا یا رسول اللہ ہم فدیہ دینے کو حاضر ہیں، آپ اسے چھوڑ دیں۔ مگر آپ نے فرمایا " اس کا ہاتھ کاٹو"۔ اُنہوں نے عرض کیا ہم پانچ سو دینار اس کے ہاتھ کے بدلے میں دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا " اُس کا ہاتھ کاٹو"۔ جب ہاتھ کاٹ ڈالا گیا تو اس عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ " یا رسول اللہ خدا کے ہاں بھی میرے بچنے کی کوئی صورت ہے؟" آپ نے جواب دیا " ہاں، اب تُو اپنے گناہ سے اس طرح پاک ہو چکی ہے جیسے آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہو"

ماعز اسلمی کا مشہور واقعہ ہے کہ اُس نے مسجد میں حاضر ہو کر عرض کیا ' یا رسول اللہ میں نے زنا کی ہے، مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے منہ پھیر کر فرمایا " جا، توبہ کر اور خدا سے مغفرت مانگ"۔ وہ پھر سامنے آیا اور وہی بات عرض کی۔ آپ نے پھر منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر سامنے آ کر اپنی بات دُہرائی۔ اس طرح جب چار مرتبہ اس نے اقرار کیا تو آپ نے پوچھا کیا تُو دیوانہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت فرمایا کیا تُو نے شراب پی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تُو شادی شدہ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ شائد تُو نے صرف بوس و کنار کیا ہو گا؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیا تو ہم بستر ہوا؟ اس نے کہا ہاں۔ پوچھا کیا تو نے مباشرت کی؟ جواب دیا 'ہاں۔ اس طرح مباشرت کے ہم معنی

کئی الفاظ بول بول کر آپ پوچھتے رہے اور وہ اثبات میں جواب دیتا رہا۔ آخر آپ نے پوچھا کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام کے طور پر وہ کام کیا ہے جو شوہر اپنی بیوی سے حلال کے طور پر کرتا ہے۔ آپ نے پوچھا اس بیان سے تیری غرض کیا ہے؟ اس نے عرض کیا پاک ہونا چاہتا ہوں۔ تب آپ نے حکم دیا جاؤ اس کو رجم کر دو۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا "دعا مانگو ماعز بن مالک کے لیے۔ اس نے توبہ کی اور ایسی توبہ کی کہ اگر وہ پوری ایک قوم پر بانٹ دی جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے"۔

غامدیہ کا واقعہ بھی حدیث کے مشہور واقعات میں سے ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ میں زنا کی مرتکب ہوئی ہوں، مجھے پاک کر دیجیے" آپ نے جواب دیا "جا، توبہ کر اور اللہ سے مغفرت مانگ"۔ اس نے عرض کیا آپ مجھے بھی ماعز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں؟ میں عرض کرتی ہوں کہ مجھے زنا کا حمل ہے"! آپ نے فرمایا "جا اور جب تک بچہ نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک ٹھیر"۔ جب زچگی ہو گئی تو وہ پھر حاضر ہوئی اور کہا کہ بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ اب کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا "اس کو دودھ پلا۔ رضاعت ختم ہونے کے بعد دیکھا جائے گا" جب رضاعت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ پھر بچہ کو لیے ہوئے آئی اور عرض کیا کہ میں اس سے بھی فارغ ہو چکی ہوں۔ تب آپ نے بچہ کو ایک مسلمان کے حوالہ کیا کہ اس کی پرورش کرے اور اس عورت پر رجم کی حد جاری کی۔ اس واقعہ کے بعد کہیں حضرت خالد بن ولید کی زبان سے اس عورت کے حق میں برے الفاظ نکل گئے حضور نے سنا تو فرمایا "خبردار اے خالد! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے"۔ پھر آپ نے خود اس کی میت پر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

جنگ قادسیہ کے موقع پر ابو محجن ثقفی شراب نوشی کے جرم میں محبوس تھے۔ جب ہنگامۂ جنگ برپا

ہوا تو ابو محجن قید خانہ میں تڑپنے لگے اور حضرت سعد بن وقاص (اسلامی فوج کے جنرل) کی بیوی سے انہوں نے درخواست کی کہ مجھے معرکہ میں شریک ہونے کے لیے چھوڑ دو۔ اگر میں جنگ میں مارا گیا تو سزا کی حاجت ہی نہ رہے گی، اور اگر زندہ رہا تو خود آکر پاؤں میں بیڑیاں پہن لوں گا۔ ایک مسلمان، خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہوتا، اس کا وعدہ اتنا وزن رکھتا تھا کہ حضرت سعد کی بیگم صاحبہ کو اس پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے ابو محجن کو نہ صرف رہا کر دیا بلکہ سواری کے لیے حضرت سعد کی بہترین گھوڑی بھی دی۔ جنگ میں اُس شخص نے جس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے لگنے کی سزا تجویز کی گئی تھی، اسلام اور حکومت اسلامی کے لیے وہ جانفشانی دکھائی کہ خود حضرت سعد دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اور جب معرکہ ختم ہوا تو اس اللہ کے بندے نے اپنے وعدہ کے مطابق خود آکر بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد نے ان کی اس مجاہدانہ سرفروشی کے صلہ میں ان کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ "جو شخص خدا کی راہ میں ایسی جاں نثاری دکھاتا ہے میں اس کی پیٹھ پر کوڑے نہیں برساؤں گا۔" ابو محجن نے جواب دیا کہ "میں بھی اب شراب نہ پیوں گا۔ کیونکہ اب تک تو یہ توقع تھی کہ تم حد جاری کر کے مجھے پاک کر دو گے۔ مگر تم نے اس توقع کا خاتمہ کر دیا۔"

یہ واقعات کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ ان سے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ اسلام میں سزا کا تصوّر کیا ہے اور اسلام کس طرح جرائم کا سدِّباب کرنے کے ساتھ ساتھ مجرموں کے اندر بلند ترین اخلاقی احساسات پیدا کرتا ہے اور کس طرح اسلام میں مجرموں کو سزا دینے کے بعد از سرِ نو سوسائٹی کے ایک معزز رکن کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ جو لوگ اس قانون کو وحشیانہ قانون کہتے ہیں وہ خود وحشی ہیں۔ تہذیب نفس اور انسانیت فاضلہ کے جس بلند مرتبے پر اس قانون نے بنی آدم کو پہنچا دیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہاں ملتی ہے؟

(۴) - اقامت حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، زمانہ

جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے زمانہ میں بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ملزم کے حالات سے اگر ثابت ہو کہ حقیقت میں وہ چوری پر مجبور ہو گیا تھا تب بھی اس کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں کا قصہ آثار میں منقول ہوا ہے کہ انہوں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا تھا۔ مزنی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ آپ نے مقدمہ کی تحقیقات کے بعد حکم دے دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ پھر دفعتہً آپ کو ان کے حالات کی طرف توجہ ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ "تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز کھائے تو اس کے لیئے وہ جائز ہو"۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چھوڑ دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اس قسم کی اور متعدد مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون اندھا قانون نہیں ہے بلکہ وہ فرق کرتا ہے اُس شخص میں جو حقیقتاً ارتکاب جرم پر مجبور ہو گیا ہو، اور اُس شخص میں جس نے حقیقی مجبوری کے بغیر جرم کیا ہو۔ اسی بنا پر غیر شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانی میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر قحط کے مارے ہوئے شخص اور کھاتے پیتے شخص کی چوری کو ایک مرتبہ میں نہیں رکھا گیا۔

اسلام اور وطنیت

(۲)

(از جناب مولوی صدرالدین صاحب)

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حُبِّ وطن بھی دوسرے دُنیوی تعلقات اور بشری جذبات کی طرح ایک مادّی تعلق کا نام ہے بلکہ درحقیقت اعزہ و اقارب، احباب اور ہم نفسوں کی اور اپنے مساکن اور وسائل معیشت کی محبت ہی کا مجموعی نام حُبِّ وطن ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو الگ کر کے وطن کسی چیز کا نام نہیں ہے اور وہ مٹی یا پتھر ہونے کی حیثیت سے کسی انسان کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اسلام کا جو نقطۂ نظر بالعموم متاعِ حیاتِ دُنیا اور مرغوباتِ نفس کے بارے میں ہے، وہی وطن کے بارے میں بھی ہے اور وطن کو کوئی ایسی خصوصیت حاصل نہیں کہ اس کے لیے سب سے الگ کوئی مخصوص زاویۂ نظر اختیار کیا جائے جس طرح دنیا کی کسی عزیز سے عزیز شے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کی طلب و محبت میں خلل انداز ہو اسی طرح وطن کی محبت اور عصبیت بھی اس حق سے یکسر محروم ہے۔ دنیا کے تمام دوسرے مادّی رشتوں کی طرح یہ بھی بنی نوع انسان کے لیے ایک فتنہ بلکہ فتنوں کا مجموعہ ہے۔ اسے پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں انسان کی آزمائش ہو۔ اگر وہ خدا کے ساتھ انسان کی محبت میں، یا بالفاظِ دیگر اسلام کی راہِ راست پر چلنے میں مانع نہ ہو تو اس سے تمتع کرنا انسان کے لیے حق ہے۔ اور اگر وہ خدا کی محبت میں حائل ہو جائے تو وہ انسان کا "عدو" ہے جس کے گلے پر چھری پھیر دینا ہی مسلمان ہونے کے لیے شرط اوّل ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ خدا اور وطن مدمقابل ہو جائیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اپنے کو مسلمان اور خدا پرست بھی کہے اور ساتھ ہی اس روحانی دشمن سے راہ و رسم بھی رکھے۔ اسلام کو

اس سے غرض نہیں کہ کس کے دل میں وطن کی محبت کتنی ہے۔ اسے اس سے بھی بحث نہیں کہ کون اپنے وطن کی عزت کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ اس کی طرف سے اس امر کی پوری اجازت ہے کہ انسان اپنے وطن کی ترقی میں حصہ لے اور اس کی فلاح و آسائش میں ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ لیکن جب وطن اپنی ان حدود سے نکل کر انسان کی روح سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی ہر خواہش اور مصلحت کا پابند ہو کر رہے، اور ضرورت پیش آنے پر اپنی پیشانی خدا کے سامنے سے اٹھا کر دھرتی ماتا کی مورتی کے آگے ٹیک دے، تو اسلام ایسے وطن کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے والے کو ننگِ ایمان، وطنی کشش سے مغلوب ہو جانے والے کو جہل کا پرستار، اور طعنہ ہائے اغیار سے متاثر ہو جانے والے کو جاہلیت کا غلام قرار دیتا ہے۔ ایسے ہی مواقع مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حقیقی فرق و امتیاز کے مواقع ہوتے ہیں۔ انسان انہی موقعوں پر چھانٹا جاتا ہے۔ وطن کو چھوڑ کر خدا کی طرف جائے تو حزب اللہ کا رکن ہے۔ خدا کو چھوڑ کر شیطان کی طرف جائے تو حزب الشیطان کا رکن ہے۔

اسلام سے وطنیت کا تصادم اب اس امر کی توضیح باقی رہ جاتی ہے کہ اسلام کے مصالح اور اس کے اصول سے حُبِّ وطن کے تصادم کا کیا مفہوم ہے، اور اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ اس کے متعلق شائد آپ کو تاریخ اسلام کا ایک ہی صفحہ پوری طرح کفایت کرے گا، اور یہ وہی صفحہ ہے جس میں کلمۂ حق کہنے والے مجرم، جوارِ کعبہ سے نکل نکل کر شمال کی طرف جاتے اور مدینہ کی گلیوں میں پہنچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہجرت کے فلسفے اور اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ مکّہ جیسے محبوب وطن سے ـــــ جس سے بڑھ کر محبوبیت کا دعوےٰ شائد کسی اور خطۂ ارض کے متعلق کسی مسلمان کی زبان سے نہیں سُنا جا سکتا ـــــ نہتّے، فاقہ مست، بے یار و مددگار، ستم رسیدہ، اخستہ حال اور ناتواں انسانوں کو کیوں نکل جانے کا حکم دیا گیا؟ محض اس لیے تاکہ خدا ہی کی عبادت ہو سکے اور وطن کی محبت میں پھنس کر وہ کفار کے ہاتھوں اتنے مجبور نہ ہو جائیں کہ صداقت کے اعلان سے باز رہیں اور

ایک خدا کے بجائے تین سو ساٹھ خداؤں کی پرستش کریں۔ قرآن کے الفاظ جو ہجرت کے سلسلہ میں نازل ہوئے، یہ ہیں:۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ..... وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ الخ (عنکبوت ۔ ۷)

اے میرے وہ بندو جو مجھ پر ایمان لائے ہو! میری زمین بہت وسیع ہے، پس (کسی خاص مقام کی پابندی تمہیں میری پرستش سے نہ روکے) تم بہرحال میری ہی عبادت کرو (خواہ اس مقصد کے لیے تمہیں اس وسیع زمین کے کسی خطہ میں جانا پڑے)، کیونکہ ہر شخص کو مرنا ہے، پھر ہماری ہی طرف بالآخر تم لوٹ کر آؤ گے ..... اور یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور دل لگی ہے۔

یہ چند الفاظ اسلامی تاریخ اور فلسفہ کا سب سے عظیم الشان باب اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ اُس وطن کی حقیقت خدا پرستی کے مقابلہ میں کتنی حقیر ہے جو آج تہذیب نو کے تخت پر بیٹھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کا صور پھونک رہا ہے۔ مکہ نہ صرف عام مسلمانوں کو بلکہ پیغمبر عالم تک کو سارے جہان سے زیادہ عزیز تھا۔ لیکن اس کی محبت عباد اللہ کو اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت کے اظہار سے روکتی تھی، اور معبود حقیقی کا غیر متبدّل مطالبہ یہ تھا کہ اِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (میری ہی عبادت کرو)۔ اب ایک طرف وطن کی کشش تھی۔ گھر بار اہل و عیال اور قبیلہ و خاندان کی محبت تھی۔ دوسری طرف احکم الحاکمین کا یہ نہ بدلنے والا فیصلہ تھا۔ وطن کی محبت اور اس کی مصلحت کا تقاضا تھا کہ نہ مکہ سے باہر قدم رکھیں، کہ یہ گوشت کے ناخن سے جدا ہونے کا ہم معنی تھا، اور نہ قریش کی مستحکم سیادت و عظمت اور باہمی اتحاد و عصبیت کو کسی طرح گزند پہنچے کہ مادہ پرستی کی دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی مصلحت نہیں۔ لیکن اگر وہ اس تقاضہ کو پورا کرتے تو سب سے پہلے انہیں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان سے زبان کو روکنا پڑتا۔ "فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ" کا مطالبہ خداوندی یہ تھا کہ

دینا پڑتا، جیسا کہ اس دورِ مظلومیت کی اسلامی تاریخ شہادت دے رہی ہے۔ لہذا خدا نے اپنے پرستاروں کو حکم دیا کہ وطن کی محبت اور اس کی خیر خواہی کے خوفناک فتنہ سے، جو عدو" بن کر ان کی متاع ایمان کو پامال کر دینا چاہتا تھا، چوکنے ہو جائیں اور اگر انہیں یہ ایمان کی متاع واقعی عزیز ہے اور وہ اس کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف ہیں، تو انہیں چاہیئے کہ اس کی حفاظت کی خاطر وطن اور اہل و عیال کے دنیوی تعلقات کی پاسداری سے یکلخت منہ موڑ کر دنیا کے کسی ایسے گوشے میں چلے جائیں جہاں خدا کی آزادانہ عبادت ہو سکے اور اسی کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے۔ کیونکہ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ اگر اس کا ایک گوشہ اِیَّایَ فَاعْبُدُوْنَ کی اجازت دینے سے انکار کرتا ہے، تو پابہ گِل ہو کر کیوں رہ جاؤ؟ اسی زمین کے طویل و عریض دامن میں اور کتنے ہی گوشے مل جائیں گے جہاں تم اپنے اصلی نصب العین کے مطابق عمل کر سکتے ہو۔ یہ ہے اسلام یعنی ایای فاعبدون اور وطنیت کے تصادم کے وقت قرآن کا فیصلہ۔

یاد رہے کہ مذکورہ بالا آیات سورۂ عنکبوت کی آیات ہیں، جس کا عنوان ہی ہجرت ہے اور جس کی پہلی ہی آیت میں تعلقات دنیوی کی قربانی شرط ایمان ٹھیرائی گئی ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے ہم نے اپنے مضمون کی ابتدا میں اس کے عموم کو باقی رکھ کر ہی اس کی تشریح کی تھی۔ لیکن پوری سورہ کے مضمون کو سامنے رکھ کر، اور خصوصاً اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنَ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ حُبِّ وطن کی قربانی ہی اس آیت میں مقصود بالذات ہے اور اس سورہ کی روح پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس دُنیائے لہو و لعب کی کسی محبوب سے محبوب چیز کو، اور خصوصاً وطن کی محبت کو کسی حال میں بھی یہ استحقاق نہیں پہنچتا کہ اِیَّایَ فَاعْبُدُوْنَ کہہ کر انسان کے لیے جو ضابطۂ حیات مقرر کیا گیا ہے اس کے ایک گوشے میں بھی تغیر و تبدّل کر سکے۔ جو چیز ایسا داعیہ لے کر سامنے آئے، عبدِ مومن

کا فرض ہے کہ پوری عزیمت اور استقلال کے ساتھ اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور ایسے موقع پر دنیا کی محبت اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے تو قرآن اُسے اسلامی جماعت میں شمار کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، خواہ وہ زبان سے لاکھ بار ایمان کا اقرار کرے:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا	جو لوگ ایمان لائے لیکن جنہوں نے (خدا کے حکم پر)
مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى	ہجرت نہیں کی، ان سے تمہارا کسی طرح کی موالات کا بھی رشتہ
يُهَاجِرُوْا (الانفال - ۱۰)	نہیں تا وقتیکہ وہ ہجرت نہ کریں۔

کیونکہ یہ ہجرت نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ مقصود حقیقی کے مقابلہ میں ایک دنیوی رشتہ کو ترجیح دی گئی، اور ایمان کے مدعی ایمان کی آزمائش گاہ میں ناکام رہے۔ پھر ایسے لوگوں کو جنہوں نے خدا کی طلب پر وطن کی محبت کو مقدم رکھا ہو کس طرح اللہ کی جماعت کا رُکن کہا جا سکتا ہے؟ یہ کام مومنین کا نہیں بلکہ کفار اور منافقین کا ہے کہ جب ان سے ایمان کی قربان گاہ پر جان و مال اور حبِ وطن کی قربانی مانگی جائے تو وہ کنّی کاٹ جائیں۔ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ - اور آخر میں ایسے لوگوں کا انجام اس دنیا سے رخصت ہوتے اور تمام مادی علائق سے علیحدہ ہوتے وقت نہایت حسرت ناک ہوگا، جس کی تصویر قرآن ان الفاظ میں کھینچتا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ	ان لوگوں سے جن کی جانیں فرشتے اس حال میں
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا	نکالتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوتے
مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ	ہیں، فرشتے کہتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے
اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا	ہیں کہ ہم دنیا میں مجبور اور بے بس تھے (جس کی وجہ
فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ	سے کافروں کے تشدد نے ہمیں علانیہ حق پرستی سے باز

مَصِيْرًا (نساء - ۱۴) رکھا) فرشتے جواب میں کہتے ہیں کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں (حق کی خاطر وطن کے تعلق سے بے نیاز ہو کر) ہجرت کر جاتے؟ پس ایسوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جو بہت بری جگہ ہے۔

جو بات اہل ایمان سے ہجرت کا حکم دیتے وقت کہی گئی تھی وہی دُنیا پرستوں سے آخرت میں جزا و سزا کے وقت کہی جائے گی کہ مانا تُم دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کمزور و ناتوان تھے اور وہ تمہیں آسمانی بادشاہت کا حلقہ بگوش بننے سے روکتے اور خدا کی خوشنودی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے زبردستی منع کرتے تھے۔ لیکن کیا زمین کی پہنائی صرف تمہارے وطن ہی تک محدود تھی؟ پھر اگر تم دُنیا پر مفتون نہ تھے اور رغائب نفس کی دلفریبیوں نے تمہاری نگہ بصیرت سے شاہد حقیقی کا جمال اوجھل نہ کر دیا تھا تو کیوں نہیں ایسا ہوا کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات، وطن اور وطن کی گیرائی جو شے بھی خدا کے ساتھ تمہاری عبدیت کے اظہار میں حارج ہوئی تھی اس کو تم ٹھوکر مار دیتے اور زمین کی پھیلی ہوئی وسعتوں میں کوئی دوسرا مامن تلاش کر لیتے؟ خواہ اصحاب کہف اور اصحاب موسیٰؑ کی طرح زرخیز و سرسبز میدانوں اور ترقی یافتہ و متمدن آبادیوں کو خیرباد کہہ کے تمہیں بے آب و گیاہ ریگزاروں اور پہاڑوں کے اندھیرے غاروں میں ہی کوئی مامن کیوں نہ ملتا۔ لیکن جب تم اپنے حقیقی فرض کی ادائیگی کے لیے دُنیائے دوں کے ایک رشتہ رحُبِّ وطن کو کاٹنا گوارا نہ کیا اور خدا پرستی پر وطن کی محبت اور اس کے فائدوں کو ترجیح دی تو آج بھی اپنے اسی خود ساختہ معبود (وطن) سے نجات مانگو، ہم تو ایسے نافرمانوں کو جو اپنے ماوائے وطن کو ہماری رضا سے زیادہ عزیز رکھتے تھے آج ماوائے جہنم ہی دیں گے۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔

"فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ" کی حقیقت پر ایک بار ذرا اور پھیل کر نظر ڈالیے، کہ بحث کا اصل مقصود اسی کی گہرائیوں میں مستور ہے۔ یہ آیت مکّی ہے۔ زمانہ ہجرت سے ذرا پہلے نازل ہوئی ہے

تمام مکی آیات و سُور کو پڑھ جائیے، ہر جگہ اسلام کے اصول و کلیات ہی کے مباحث ملیں گے۔ توحید، معاد، رسالت، نماز، صدقات اور عام اصول اخلاقِ انسانی کے سوا آپ ان میں اسلامی شریعت اور قانون کے جزئیات کا کوئی ذکر نہ پائیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ بآسانی نکل سکتا ہے کہ زمانۂ قیامِ مکہ میں کفارِ قریش نے قرآن کی جو کچھ بھی مخالفت کی تھی، لامحالہ ان کا تعلق انہیں اصولی تعلیمات سے تھا۔ وہ اگر مسلمانوں کو روکتے تھے تو ایک خدا کی پرستش سے، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے اعلان سے، لات و منات کی توہین سے، سردارانِ قریش کی تضلیل سے۔ انجام کار جب باطل کی قہاریت اور حق کی مقہوریت اپنی انتہا کو پہنچنے کو آئی، اور معاندینِ حق نے قرآن کی ان چند سیدھی سادھی سچائیوں کا نام و نشان مٹا دینا چاہا اور وطن (مکہ کی سرزمین) میں ان بنیادوں پر اُٹھنے والی عمارت کے قیام کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو اللہ نے مسلمانوں کو اسی امکان کی تلاش میں، اپنی زمین کی وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور ہر قربانی اور ہر قیمت پر اپنی ہی عبادت پر ثابت قدم رہنے کا غیر مبہم حکم دیا۔ اسی لیے مخلصین کے گروہ نے گھربار کو الوداع کہی۔ اور مادہ پرستوں اور دنیا کے عاشقوں کو دکھا دیا کہ خدا کی مرضی کے سامنے دنیا کا مضبوط سے مضبوط تعلق بھی کتنا حقیر، کتنا کمزور اور کتنا ناقابلِ اعتناء ہے۔

لیکن کیا مدنی آیات کے نزول کے بعد بھی "فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ" کی وسعت اُنہی اصول اور کلیات تک محدود رہی جن کے خلاف مکہ کے ائمۂ کفر نے تلواریں کھینچی تھیں؟ اور کیا آج بھی وطن کا تعلق اسلامی مصالح سے اُسی وقت متصادم کہا جائے گا جب کہ وہ مسلمانوں کو صرف خدا کی یکتائی کے اعلان سے روکے یا کفارِ قریش کی طرح رسولِ اُمی فداہ ابی و امی کی صداقت کے اقرار سے مانع ہو؟ بالفاظِ دیگر کیا عبادت کا مفہوم ایمانیات کے باب اور درود و صلوٰۃ تک ہی محدود ہے، جیسا کہ قبل زمانۂ ہجرت تھا؟ ممکن ہے خانقاہ کے رہبان اور سیاستِ حاضرہ کے مصلحت کوش اس کا جواب اثبات میں دیں، لیکن جب اسلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا

ہے اس کے کسی اشارہ وکنایہ سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کی لغت میں عبادت کے معنی ہیں خدا کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے۔ یعنی انسانوں کے لیے جو احکام خدا نے دیے ہیں اور جو ضابطۂ حیات اس نے تجویز کر کے نازل فرمایا ہے، ٹھیک ٹھیک اسی کے مطابق عمل کرنا۔ لہٰذا جس طرح مکّی صورتوں کی اصولی تعلیمات عبادت الٰہی کے دائرہ میں آتی ہیں اسی طرح ہجرت کے بعد نازل ہونے والی جزئی تعلیمات اور فرعی احکام بھی اس دائرہ میں جگہ پانے کے سزاوار ہیں، اور وطنی مصالح کا اسلام کے آئینِ تمدّن ومعاشرت اور ضابطۂ سیاست ومعیشت سے متصادم ہونا خدائے اسلام کی نگاہ میں بعینہٖ وہی نوعیت رکھتا ہے جو توحید ورسالت جیسی اصولی صداقتوں کا تصادم۔ جو لوگ ایسا نہیں سمجھتے وہ گویا کتاب اللہ کے بعض حصّوں پر ہی ایمان لاتے ہیں اور عملاً بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور ایسے کور بصروں کو قرآن جس نام سے موسوم کرتا ہے اس کے تصوّر ہی سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔

تصادم کا فلسفہ بھی کسی قدر غور و فکر کا محتاج ہے۔ عبادت کے مفہوم کی طرح اس وطنی اور ملی مصالح کے تصادم کا مفہوم بھی موجودہ جاہلیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی نذر ہو چکا ہے۔ اور آج خود مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا دماغ اس کے صحیح ادراک سے قاصر ہے۔ وہ اب اس خام خیالی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جب تک وطنی مصالح صاف اور صریح لفظوں میں منارۂ مسجد پر اذان دینے یا گوشۂ خانقاہ میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر جہری کرنے سے نہ روکیں اور جب تک آگ کے انگاروں، پتھر کی سلوں، تلوار کی باڑھوں اور سنگین کی نوکوں سے استیصال حق میں کام لیا جائے اُس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وطن کی محبت اور عصبیت ومصلحت اسلام سے متصادم ہو رہی ہے۔ ان نادان مسلمانوں یا دانا منافقوں سے کون کہے کہ اب زمانہ کی رفتارِ ارتقا نے شرار بولہبی کی سوزشوں اور سیف بوجہلی کی خون آشامیوں کو لوہے پتھر سے نکال کر کتاب کے حروف

ہیں منتقل کر دیا ہے۔ مادیت کی اسلام دشمنی اب تیر و تفنگ سے مسلح ہو کر نہیں آتی کہ مسلمانوں کے اِن خاکی اجسام کو قتل کر ڈالے، بلکہ کاغذ کے سیاہ نقوش کا خوشنما لباس زیب تن کر کے آتی ہے کہ ان کی روحوں کو اندر ہی اندر ذبح کر ڈالے اور اگر موقع ہو تو خود "روشن خیال" اور "فراخ دل" نسل مسلم سے اس کا خون بہا بھی لے۔ پس اگر وطن کے مصالح رفتارِ زندگی کو ایسے رُخ پر ڈالنا چاہیں جہاں تسبیح اور مصلّٰی پر تو ہاتھ نہ ڈالے جائیں مگر تہذیبِ وقت کے فریب کار ہاتھ اس اسلامی روح ہی کو کچل کر رکھ دیں جس کی وجہ سے تسبیح، تسبیح ہے اور مصلّٰی، مصلّٰی، تو یقین فرمائیے کہ ایسی جگہ وطن اسلام سے متصادم ہو رہا ہے، اور یہ تصادم اس تصادم سے کہیں زیادہ مہلک اور خوفناک ہے جو تیر و تفنگ سے ہوتا ہے۔

"عبادت" اور "تصادم" کی تشریح کو نظری حیثیت سے سمجھ لینے کے بعد اسوۂ رسول اور اسلام کی عملی تعلیمات کی روشنی میں بھی غور فرمائیے، حقیقت حال اور زیادہ نمایاں اور بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی (باقی)

مطبوعات

حسن المقال فی رویت الہلال (بزبان اردو) تالیف مولانا عبید اللہ صاحب مجہری ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ: سلیمانی پریس۔ شاہ کی املی پٹنہ

رویت ہلال کے باب میں عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا ثبوت "شہادت شرعیہ" کے بغیر نہیں ہو سکتا اور یہ کہ شہادت کے لیے جو شروط و قیود معلوم و معروف ہیں ان سب کا لحاظ کرنا رویت کی خبر پر اعتماد کرنے کے لیے ضروری ہے۔ انہی غلط فہمیوں کی بنا پر خطوط، اخبارات، ٹیلیفون اور تار کی اطلاعوں کو "مطلقاً" ناقابل اعتماد ٹھیرایا جاتا ہے، حتی کہ ان ذرائع سے متواتر خبریں پہنچنے پر بھی ایک شہر کے لوگ صوم و افطار اور عید اضحی کے بارے میں صرف اپنے شہر کی رویت ہی پر اعتماد کیا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس وجہ سے جو افتراق برپا ہے اور جس طرح عیدین اور آغاز ماہ رمضان میں اختلاف عمل رونما ہوتا ہے اس کی کیفیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ضرورت تھی کہ خالص علمی طریق پر اس مسئلہ کی تحقیق کی جاتی تاکہ شریعت کے حقیقی احکام پر جو پردے مدتہائے دراز کی غلط فہمیوں سے پڑ گئے ہیں وہ اٹھ جاتے۔

اللہ مصنف کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کر دیا ہے۔ رویت اور شہادت کے اصولی فرق کو جس خوبی سے انہوں نے واضح کیا ہے وہ صرف رویت ہلال ہی کے باب میں نہیں بلکہ دوسرے علمی و دینی مسائل میں بھی مفید ہوگا جن میں قلت علم کی وجہ سے آج کل لوگ عموماً ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ خط، تار، ٹیلیفون اور اخبارات کی اطلاعات کے باب میں بھی ان کی تحقیق غایت درجہ تشفی بخش ہے، اور مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ اجتہاد میں جس اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہے اس کو بھی انہوں نے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ رسالہ صرف علماء کے لیے مفید ہے۔ بہتر ہو کہ دقیق علمی بحثوں سے قطع نظر کر کے ایک مختصر سا رسالہ اور شائع کیا جائے جس

میں سلیس اور عام فہم طریقہ پر مسئلہ کی حقیقت واضح کی گئی ہوتا کہ عام مسلمانوں کو بھی صحیح معلومات حاصل ہو جائیں۔

رویت ہلال کی خبروں کا صحیح انتظام کرنے کے لیے ہمارے نزدیک سب سے زیادہ مناسب تجویز یہ ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ سے ان اطلاعات کے نشر کا بندوبست کیا جائے۔ پشاور، لاہور، دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی، مدراس، کلکتہ اور بعض دوسرے مرکزی مقامات پر نشرگاہیں موجود ہیں۔ ان سب مرکزوں میں مسلمانوں کی بھی ذمہ دار مذہبی جماعتیں اور قابل اعتماد شخصیتیں موجود ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر سے بآسانی یہ معاملہ طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذمہ دار اشخاص یا جماعتوں کو رویت ہلال کی اطلاعات بروقت نشر کرنے کا موقع دیں۔ اگر معروف اشخاص خود نشرگاہ میں جا کر اپنی زبان سے آلۂ نشر پر اعلان کریں گے، تو ان کی آواز ہر وہ شخص بآسانی پہچان سکیگا جو ان سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس طرح جعل و فریب کا بھی کوئی موقع باقی نہیں رہ سکتا۔ اس نشر صوت کی حیثیت قریب قریب وہی ہوگی جو بالمشافہ کسی مخبر عدل کے خبر دینے کی ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس تجویز پر غور کر کے مناسب طریق کار اختیار فرمائیں گے۔

فاتحہ تفسیر نظام القرآن (بزبان عربی) | تالیف علامہ فراہی رحمہ اللہ۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ:- دفتر "الاصلاح"۔ سرائے میر۔ اعظم گڈھ

یہ علامہ مرحوم کی مشہور تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے جس میں فاضل مصنف نے اپنے مدۃ العمر کے تدبر فی القرآن کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ نہ صرف ان کے طریق تفسیر کو سمجھنے کے لیے اس مقالہ کا مطالعہ ضروری ہے، بلکہ جو شخص قرآن مجید کو محققانہ طرز پر سمجھنا چاہتا ہو اس کے لیے بھی یہ مقدمہ ایک اچھا رہنما ثابت ہوگا، کیونکہ اس میں ایک فاضل محقق نے ان مہمات مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو قرآن کا تحقیقی مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔ تفسیر قرآن کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ آیات اور سورتوں کے ربط و نظام کا ہے اور یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ بہت سے مفسرین نے سرے سے ربط و نظام کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن علامہ مرحوم اس کے قائل ہیں اور انہوں نے اس کے وجوہ و دلائل بیان کیے ہیں جو ہر محقق کے لیے

لائق غور ہیں۔ اسی طرح مصنف نے ان سوالات پر بھی اصولی بحث کی ہے کہ تفسیر قرآن میں خود قرآن سے، شانِ نزول سے، احادیث اور اقوالِ صحابہ سے، کلامِ عرب سے، کتبِ سابقہ سے کس طرح مدد لینی چاہیئے۔ یہ سب اہم مباحث ہیں اور ان میں طالبِ علم کے لیے بہت کچھ فوائد ہیں۔

مگر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصنف کی جلالتِ علمی کو دیکھ کر ہر اس بات کو قبول کر لیا جائے جو انہوں نے لکھی ہے جس طرح ہر انسان کے کلام میں لغزشیں ہوتی ہیں اسی طرح مصنف کے کلام میں بھی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ مصنف نے احادیث کی کمزوری ثابت کرتے ہوئے چند مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جو بخاری اور مسلم نے وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا ہے) کی تفسیر میں حضرت ابوذر غفاری سے نقل کی ہے کہ مستقرھا تحت العرش (سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے) اور فانھا تذھب حتی تسجد تحت العرش (وہ جا رہا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے)۔ مصنف نے اس حدیث کو ایسا بدیہی البطلان سمجھا کہ اس کو باطل ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ لیکن اس قسم کا حکم لگانے میں انہوں نے ویسی ہی غلطی کی ہے، جیسی ان سے پہلے کے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ اپنے عہد کی معلومات پر بسا اوقات، انسان اتنا زیادہ بھروسا کرنے لگتا ہے کہ گویا وہ علم کی آخری حد کو پہنچ چکا ہے، اور اسی مبالغہ آمیز اعتماد کی وجہ سے وہ اکثر ان چیزوں کو بےتکلف غلط بلکہ بدیہی البطلان قرار دے بیٹھتا ہے جو اس کے وقتی علم کے خلاف ہوتی ہیں۔ حدیث کے معاملہ میں تو ایسے احکام لگا دینے کی جرأت زیادہ آسان ہے کیونکہ راویوں کو جھوٹا قرار دے دینا کونسا مشکل کام ہے۔ رہا قرآن تو جو لوگ ایمان سے محروم ہیں وہ اس کو بھی نعوذ باللہ مہمل کہہ دینے میں تامل نہیں کرتے۔ البتہ اہلِ ایمان کو جب وہاں ایسی کوئی چیز نظر آجاتی ہے تو وہ کچھ دیر کسمسانے کے بعد آخر کار عجیب عجیب تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر علمِ انسانی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ایسے مواقع پر قطعیت کے ساتھ حکم لگا دینے کی جرأت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

فلکیات سے متعلق کچھ مدت پہلے تک انسان کا علم اس قدر محدود تھا کہ وہ اپنے نظامِ شمسی ہی کو کائنات

سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ سورج ہے جو اپنی جگہ قائم ہے۔ اس علم پر اس کو اتنا وثوق تھا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِي (سورج چل رہا ہے) کی حقیقت ہی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا (اپنے مستقر کی طرف جارہا ہے) کو سمجھ سکتا۔ اسی بنا پر لوگ اس آیت کی تاویلیں میں ٹھوکریں کھایا کرتے تھے، اور بعض کم فہم اس سے یہ نتیجہ بھی نکال بیٹھتے تھے کہ یہ خدا کا نہیں بلکہ ایک اُمّی عرب کا کلام ہے (نعوذ باللہ) لیکن اب فلکیات کے جدید مشاہدوں سے یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ سورج اپنے پورے نظام کو لیے ہوئے کسی طرف جارہا ہے، اور اس نظامِ شمسی کے علاوہ بے شمار دوسرے نظامات بھی ہیں جن کے مرکز اپنے متعلقین کو لیے ہوئے اسی طرح فضائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں۔ جن ستاروں کو اب تک ثوابت سمجھا جاتا تھا، قریب قریب وہ سب کے سب متحرک پائے گئے ہیں اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱ میل سے ۱۰۰ میل فی سکنڈ تک کی رفتار سے وہ اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ اب صرف یہ امر پردۂ خفا میں رہ گیا ہے کہ وہ "مستقر" کونسا ہے جس کی طرف یہ مختلف نظامات فلکی کے مرکز رواں دواں ہیں؟ اس سوال کو انسان اب تک حل نہیں کر سکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اسے کائنات کے مرکز کا پتہ نہیں چل سکا۔ بہت ممکن ہے کہ کائنات میں ایک مرکزی نقطہ ایسا ہو جہاں اللہ تعالے نے اپنی تجلیات کو مرتکز فرما رکھا ہو، اور وہیں سے سورج اور دوسرے نظامات کے مرکزوں پر اس قوّت (انرجی) کا فیضان ہو رہا ہو جو بے حد حساب پیمانے پر ان مرکزوں سے ہو کر ان کے تابع ستاروں پر منعکس ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی مرکز کائنات کا نام کلام الٰہی میں عرش رکھا گیا ہو۔ ممکن ہے کہ یہی عرش اس سورج اور تمام سورجوں کا "مستقر" ہو۔ ممکن ہے کہ اسی مستقر کی طرف ان کے حرکت کرنے کو اللہ کے نبیؐ نے "سجدہ" سے تعبیر کیا ہو۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اب تک انسان پر منکشف نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن جو امر اس نظریہ کو تقویت پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ فلکی طبیعیات Astro-physics کے ماہرین آج تک اس سوال کو حل نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بے حد و بے حساب قوت جو سورج سے ہر لمحہ خارج ہو رہی ہے اس کا ماخذ و منبع کیا چیز ہے؟ جتنے نظریات انہوں نے قائم کیے ہیں وہ سب تشنۂ ثبوت

ہیں اور تھک کر انہیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی "غیر معلوم سرچشمہ" Unknown source ہے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ "غیر معلوم" سرچشمہ سورج کے جرم میں نہیں ہے بلکہ اس کے باہر کائنات کے مرکز میں ہے، اور وہاں محض طبیعی اسباب سے قوت پیدا نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایک فوق الطبیعی ماخذ سے قوت کا فیضان ہو رہا ہے، وَالعلم عند اللہ۔

پس یہ ایک بڑی غلطی ہے جس پر لوگوں کو متنبہ ہو جانا چاہیئے کہ انسان اپنے وقت کی معلومات کو حتمی و یقینی سمجھ لے اور ان کے خلاف جب کوئی حدیث یا آیت قرآنی نظر آئے تو اس کو مہمل قرار دینے لگے۔ انسان پر حقائق کا علم آہستہ آہستہ منکشف ہو رہا ہے، اور اس ترقی کے ساتھ ساتھ وہ مسلّمات خود ہی غیر مسلّم ہوتے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر احادیث اور آیات میں غلطیاں نکالنے کی جرأت کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ احادیث میں ضعیف اور موضوع روایتیں نہیں ہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر جن حدیثوں کی سند قوی ہو اُن کے معاملہ میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

کتاب کی طباعت اور ظاہری شان بہت اچھی ہے مگر جو چیز پڑھنے والے کی نگاہوں کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ عربی عبارت کو خط نستعلیق میں پڑھنا ذوق پر گراں گذرتا ہے اگر اسے نسخ ٹائپ میں چھپوایا جاتا تو اس کا حسن بہت بڑھ جاتا۔

تفسیر سورۃ تین (اردو) | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ: دفتر الاصلاح۔ سرائے میر۔ ضلع اعظم گڈھ

سورۃ تین کی یہ تفسیر مولانا مرحوم کے اسی مخصوص انداز تحقیق کی حامل ہے جس میں وہ اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے تین اور زیتون کے معانی متعین کرنے کے بعد طور سینا اور بلد الامین کے ساتھ ان کا معنوی ربط قائم کیا ہے اور اطمینان بخش دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ یہ چاروں چیزیں، جن کی قسم کھائی گئی ہے، تاریخ انسانی کے اُن چار مہتم بالشان واقعات کی نمائندگی کرتی ہیں جو سورہ کے اصل مقصد، یعنی

اثبات جزا و سزا پر بہترین شہادت دیتے ہیں۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ کی تاویل میں جو پہلو فاضل مصنّف نے اختیار کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بجائے خود صحیح ہے، مگر بیان صاف اور سُلجھا ہوا نہیں ہے۔ احوال انسانی کے تینوں مدارج، یعنی احسن تقویم پر پیدا کیا جانا، پھر اسفل سافلین میں ابتلا و آزمائش کے لیے اُتارا جانا، اور آخر کار ایمان و عمل صالح کی بدولت ترقی کر کے اس مقام پر پہنچنا جو احسن تقویم" کی فطرت کے شایاں ہے، ان مباحث کو اگر زیادہ پھیلا کر بیان کیا جاتا اور ایک ایک چیز کی تشریح فطرت انسانی کے شواہد سے کی جاتی تو حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آجاتی۔ ممکن ہے مصنف نے اختصار کی خاطر زیادہ تفصیل میں پڑنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

| مرقاۃ القرآن | تالیف مولوی محمد عبد اللہ صاحب کامل۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ انجمن ارباب ذوق۔ بھوانہ بازار۔ لائل پور

یہ مختصر کتاب اس غرض کے لیے لکھی گئی ہے کہ طلبہ عربی زبان کے قواعد کو قرآن مجید کے ذریعہ سے حاصل کریں، اور زبان سے جتنی جتنی اُن کی واقفیت بڑھے اُتنا ہی وہ قرآن کو زیادہ سمجھنے لگیں۔ مصنف نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ چالیس سبق درج کیے ہیں اور ہر سبق میں نحو کے کسی ایک قاعدہ کی بہت سی مثالیں قرآن مجید سے اخذ کر کے جمع کر دی ہیں اس کے ساتھ ہی ایک مختصر رسالہ انہوں نے کلید قرآن کے نام سے لکھا ہے جس میں اسی ترتیب کے ساتھ نحوی قواعد کی تشریح بھی کر دی ہے۔ اسکی قیمت ۸ر ہے اور یہ دونوں کتابیں مل کر عربی زبان کی تحصیل کے لیے اچھی مددگار ہو سکتی ہیں۔

| تیسیر القرآن | تالیف مولوی عبد الصمد صاحب رحمانی۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ

مکتبۂ امارت شرعیہ۔ پھلواری شریف، پٹنہ۔

یہ کتاب بھی اسی غرض کے لیے لکھی گئی ہے کہ قرآن مجید کی مدد سے عربی زبان کو حاصل کیا جائے یا بالفاظ دیگر قرآن خود اپنے آپ کو پڑھائے۔ اس میں قرآن مجید کے تقریباً تمام الفاظ کو جمع کر کے نحوی قواعد پر مرتب کیا گیا ہے اور ترتیب ایسی رکھی گئی ہے کہ طالب علم بتدریج قواعد نحویہ سے واقف ہوتا جائے، اور جتنا جتنا قواعد سے واقف ہو اُتنا ہی قرآن کو سمجھتا چلا جائے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ عربی زبان کی ابتدائی تعلیم

میں پرانی کتابوں کے بجائے اس قسم کی کتابیں داخل کر دی جائیں کہ یہ بیک کرشمہ دو کار ہے۔

تراجم علمائے حدیث ہند (جلد اوّل) تالیف مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی۔ ضخامت ۷۷ء صفحات۔ قیمت دو روپیہ ۸ر۔ ملنے کا پتہ: عبدالحی دالاخوان۔ سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ (پنجاب)۔

یہ دراصل ہندوستان کے علماء اہل حدیث کا تذکرہ ہے۔ لیکن مؤلف نے اس میں بعض ان علمائے حدیث کے حالات بھی شامل کر لیے ہیں جو گروہ "اہل حدیث" سے تعلق نہیں رکھتے، اور اسی بنا پر انہوں نے تراجم اہل حدیث کے بجائے اس کا نام تراجم علمائے حدیث رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ باقی ماندہ جلدوں کی تالیف کے موقع پر صاحب موصوف زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے کام لیں گے اور ان تمام علماء کے ساتھ پورا انصاف کریں گے جنہوں نے جماعت اہل حدیث کے مسلک سے چاہے اختلاف کیا ہو، مگر بہرحال علم حدیث کی خدمت ضرور کی ہے۔

ید بیضاء تالیف خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری بار ایٹ لا۔ ضخامت تقریباً ڈیڑھ سو صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: آرمی پریس، شملہ۔

اس کتاب میں مؤلف کے ان مضامین کو جمع کیا گیا ہے جن میں انہوں نے مختلف اعتقادی، تاریخی اور تمدنی مباحث پر اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ کتاب اس حیثیت سے قابلِ قدر ہے کہ ایک جدید تعلیم یافتہ فاضل نے اخلاص اور جذبۂ دینداری کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مؤلف کو تعلیماتِ اسلامی کے اصلی مآخذ پر کوئی گہری نظر حاصل نہیں ہے، اور وہ کسی دینی مسئلہ پر ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے بحث نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے وہ ہر جگہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکے ہیں، بلکہ بعض بعض مقامات پر اُن کے بیانات میں بلا ارادہ مغربی تصوّرات کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل تالیف میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے بار ایٹ لا مدیر رسالہ ہمایوں۔ ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ ہمایوں۔ نمبر ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

فاضل مقالہ نگار جنہوں نے اپنے رسالہ ہمایوں کے ذریعہ سے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے،

اب تک محض ایک ادیب کی حیثیت سے مشہور تھے اور لٹریچر کے دائرہ سے باہر مشکل ہی سے کبھی انہوں نے قدم نکالا تھا۔ مگر اب یہ مقالہ لکھ کر انہوں نے ہم کو یہ اندازہ کرنے کا موقع دیا ہے کہ زمانہ کی انقلابی ضربات نے احساس کی لہر کہاں تک پہنچا دی ہے۔ اس مقالہ میں مختصر مگر دلنشین طریقہ سے اس پیچیدہ مسئلہ پر بحث کی گئی ہے جو اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے پیدا ہو گیا ہے، اور چونکہ اس کا حل موقوف ہے حقیقت اسلام کے فہم پر اس لیے صاحب مقالہ نے پہلے یہ سمجھایا ہے کہ اسلام کیا ہے اور کیا چاہتا ہے، پھر ماضی بعید کی تاریخ سے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو لے کر کس طرح ایک نیا تمدّن پیدا کیا اور کس طرح جہاں بینی وجہاں بانی میں دنیا کی رہنمائی کی، پھر ماضی قریب کی تاریخ سے یہ واضح کیا ہے کہ اصول اسلامی سے بُعد اور دنیوی انحطاط دونوں کس طرح ساتھ ساتھ آئے ہیں، اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا قومی وجُود بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنی حیات اجتماعی کو اسلام کی بُنیادوں پر از سرِ نو استوار کریں اور اسی نصب العین پر اپنی تمام توجہ کو مرتکز کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خود ہندوستان کی فلاح کے لیے بھی اس کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہاں ایک "قومی جمہوری ریاست" قائم کرنے کا خیال چھوڑ دیا جائے اور مختلف قوموں کو خود اپنی تہذیب کی بنیاد پر حکومت خود اختیاری کے ذریعہ سے پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے فاضل مقالہ نگار نے بعض مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں اور چند اہم ترین مسائل کی طرف بھی قوم کے سوچنے والے دماغوں کو توجہ دلائی ہے، اگر اس سلسلہ میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جن لوگوں کو خدا نے وسائل دیے ہیں ان کو تجاویز پیش کرنے سے زیادہ بھی کچھ کرنا چاہیئے۔

میاں صاحب کوئی عالم دین نہیں ہیں اس لیے کہیں کہیں مذہبی مسائل کے بیان میں اُن کے قلم کو لغزشیں بھی ہوئی ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ کے بعض کاموں کو "مذہبی ایجادات" سے تعبیر کرنا، یا انسان کے متعلق یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا علم وعمل میں اسے اپنا شریک کار بنایا"۔ اس قسم کے بعض اور فقروں میں بھی الفاظ کا استعمال بے احتیاطی کے ساتھ کیا گیا ہے جو لائقِ اجتناب تھا۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ دیکھ کر خوشی

ہوتی ہے کہ ان کا نقطۂ نظر صحیح اسلامی مسلک کے مطابق ہے اور وقت کے مسائل میں وہ بہت سے علماء کی بہ نسبت زیادہ بہتر اسلامی ذہنیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ | تالیف جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ ضخامت ۴۵۰ صفحات قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: نمبر ۹، لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں مسلمانانِ ہند کی سیاسی تاریخ پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ موجودہ زمانہ جھوٹے پروپیگنڈے کا زمانہ ہے اور جھوٹ کو جیسا فروغ ہوتے آجکل دیکھا جا رہا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا گیا تھا ہمارے ہمسایہ بھائی کچھ عرصہ سے اس قسم کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں کلچر ہے تو ہندوؤں کی، علم اور دماغ ہے تو ہندوؤں کے پاس، حریت و استقلال کا جذبہ ہے تو ہندوؤں میں، آزادی کی جد و جہد کی تو ہندوؤں نے اور ملک کی ترقی اگر کسی کے دامن سے بندھی ہوئی ہے تو وہ ہندوؤں کا دامن ہے۔ مسلمان یا تو سرے سے ہندوستان میں موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو وہ محض سنگِ گراں ہیں جو ہندوستان کی کمر سے صرف اس لیے بندھا ہوا ہے کہ یہ ملک ابھرنے نہ پائے۔ اس جھوٹے پروپیگنڈا کا یہ عالم ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ہندوستان اور ہندو کو مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔ اسلامی ممالک سے ہندوستان کا رشتہ کٹ رہا ہے اور ہم اپنے گھر میں نحاس پاشا کے وفدکی زبان سے سن رہے ہیں کہ "اہلِ مصر جب ہندوستان کا تصور کرتے ہیں تو گاندھی اور جواہر لال کا تصور اس کے ساتھ آتا ہے"۔ حتیٰ کہ خود ہندوستان کے مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اس ملک کی جدید تاریخ میں ان کا مقام ایک حرفِ غلط سے زیادہ نہیں ہے۔ اس جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لیے بڑی ضرورت ہے کہ نہ صرف اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی اس نوعیت کی کتاب شائع ہو جیسی کہ زیرِ تبصرہ کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں واقعات سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں اپنی تباہ حالی اور اخلاقی و مادّی انحطاط کے باوجود مسلمان ہی کا دل و دماغ تھا جس نے آزادی کی روح پیدا کی، اور پھر وہ مسلمان ہی کی جرأت تھی جس نے آگے بڑھ کر آزادی کے لیے جنگ کرنے کا راستہ دکھایا۔

بہتر ہوتا کہ اس کتاب کو خالص مورّخانہ حیثیت سے لکھا جاتا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد جو حالات پیش آئے ہیں اُن کے بیان میں اگرچہ مولف نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے، لیکن زیادہ تر واقعات کا ایک رُخ دکھایا ہے جس سے لاگ اور لوث کی بُو آتی ہے۔ ایک مورخ کا فرض ہے کہ واقعات کے تمام پہلوؤں پر بے کم وکاست روشنی ڈالے اور تاریخی سٹیج کے ایکٹروں میں سے کسی کی جانب داری نہ کرے۔ گذشتہ پندرہ سال میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو جو پیہم صدمات پہنچے ہیں ان کی ذمہ داری میں کانگریس کی تائید کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی کوتاہیاں بھی شریک ہیں جنہوں نے اس سے الگ رہ کر خود کوئی صحیح تعمیری کام نہ کیا۔ یہ پہلو مولف کی نگاہ سے قریب قریب بالکل اوجھل رہ گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے زمانہ کی تاریخ لکھنے میں بے لاگ رہنا بڑا سخت ذہنی مجاہدہ چاہتا ہے۔

معرکۂ حق و باطل | تالیف مولوی محمد داؤد صاحب حنفی قاسمی مدّرس اوّل جامعہ صدیقیہ۔ جامع مسجد جونپور۔ قیمت ۴ر

اس پمفلٹ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ دوسروں پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوں۔ اس سلسلہ میں مولف نے مسلم لیگ کی پُر زور حمایت کی ہے۔

اسلامی حقوق اور مسلم لیگ | تالیف مولوی عبدالصمد صاحب رحمانی۔ قیمت ۴ر۔ مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف

اس پمفلٹ میں مسلم لیگ کے نقائص بیان کیے گئے ہیں اور اس کی پالیسی، طریق عمل اور قیادت میں علمائے کرام کے نقطۂ نظر سے جو کوتاہیاں پائی جاتی ہیں ان کی توضیح کر دی گئی ہے۔ اگر یہ پمفلٹ عدل اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ لکھا جاتا تو بلاشبہ مفید ہوتا، اور اس سے ان حقیقی نقائص کو دور کرنے میں مدد ملتی جو مسلم لیگ کے نظام میں اس وقت تک موجود ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مولف نے رسالہ اس انداز سے لکھا ہے کہ گویا وہ ایک جماعت کی طرف سے دوسری جماعت پر فرد جرم مرتب کر رہے ہیں اور اس فرد جرم کو زیادہ سے زیادہ ہولناک بنانا چاہتے ہیں۔ اس پر مزید افسوس یہ ہے کہ خود اس جماعت کی کوتاہیوں سے وہ ادنےٰ سا تعرّض نہیں کرتے جس کی وکالت کا

فرض انہوں نے انجام دیا ہے، حالانکہ اس جماعت کا دامن بھی بے داغ نہیں ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی جانب دارانہ تحریروں سے کسی فائدہ کی توقع نہیں کی جاسکتی بلکہ مضرت میں کچھ اور اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

الفرقان مجدد الف ثانی نمبر | مرتبہ جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ قیمت قسم اول عیر قسم دوم عہ۔ دفتر الفرقان بریلی سے مل سکتا ہے۔

جریدہ الفرقان نے پہلے ایک خاص نمبر مولانا اسمٰعیل شہید کی سیرت پر شائع کیا تھا جس کو ہر طرف سے خراج تحسین ادا کیا گیا۔ اب یہ دوسرا خاص نمبر ہندوستان کے اس مجاہد کبیر کی سیرت پر شائع کیا گیا ہے جس نے دَورِ اکبری کے طوفانِ جاہلیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور بالآخر طوفان کا منہ پھیر کر ہی دم لیا۔ حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ اسلام کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن کو بجا طور پر "مجدد" کا جلیل القدر خطاب دیا گیا ہے۔ اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ کرنے کے لیے اگر کوئی وقت موزوں ترین ہے تو وہ یہی وقت ہے جس سے ہم اب گذر رہے ہیں، کیونکہ جس فتنہ کے خلاف انہوں نے جہاد کیا تھا، اُسی نوعیت کا فتنہ آج پھر ہندوستان میں اٹھا ہے اور اسی شان سے اٹھا ہے کہ ایک طرف اس کے ہاتھ میں سیاسی حربے ہیں اور دوسری طرف اس کے جلو میں جُبّہ و دستار بھی ہیں۔ مولانا محمد منظور صاحب اس خدمت کے لیے تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں اور ضرورت ہے کہ بکثرت لوگ اس خاص نمبر کا مطالعہ کر کے اس سے بصیرت حاصل کریں۔ خصوصیت کے ساتھ جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" تو اس قابل ہے کہ اسے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے اور ہزاروں کی تعداد میں پھیلایا جائے۔

رسالہ "برہان" ماہوار | مرتبہ جناب مولوی سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے، فاضل دیوبند۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے ایک جدید علمی مجلس کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کا مقصد دورِ جدید میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرنا اور اسلام کے اصول و قوانین کو جدید طرز پر مرتب و مدوّن کرنا اور ان غلط فہمیوں کو

مدد کرنا ہے جو مخالفین اسلام پھیلا رہے ہیں۔ رسالہ "برہان" اسی مجلس کی طرف سے جاری کیا گیا ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس رسالہ نے ہماری زبان میں ایک بلند پایہ علمی و دینی رسالہ کا اضافہ کیا ہے۔ مضامین اور ظاہری شان دونوں کے اعتبار سے اس کا معیار بلند ہے اور ہمیں توقع ہے کہ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اس کے معیار کو اور زیادہ بلند کیا جائے گا۔

چنگاری | مرتبہ جناب سجاد ظہیر صاحب۔ چندہ سالانہ تین روپے۔ منیجر صاحب رسالہ چنگاری سہارنپور سے طلب کیا جائے۔

یہ سوشلسٹ جماعت کا پرچہ ہے جس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ڈاکٹر اشرف، سوہن سنگھ جوش، فرزند علی منصور، ہرکشن سنگھ سرجیت صاحبان اور چند دیگر حضرات شامل ہیں۔ اس میں سوشلزم کے نظریات اور ہندوستان کے سیاسی احوال پر سوشلسٹ نقطۂ نظر سے تبصرے اور اسی نوعیت کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ اکثر مضامین ان مردوں اور خواتین کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں جو نام کے لحاظ سے ابھی تک مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں۔ ہم اپنے ناظرین کو اس رسالہ کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے تاکہ وہ سوشلزم کو سمجھ سکیں اور اس کی روح سے بھی واقف ہو جائیں۔

آسان قاعدہ | تالیف جناب اے ایچ قریشی ایم اے۔ قیمت ۲/ر۔ اسٹینڈرڈ ایجوکیشنل کمپنی، پٹھان کوٹ۔

یہ قاعدہ جدید سائنٹفک طریقہ سے اردو زبان کی نوشت و خواند سکھانے کے لیے تیار کیا گیا ہے اور مصنف کا دعوے ہے کہ اس طریق تعلیم سے بالغ طلبہ پندرہ روز میں اردو کی آسان کتابیں پڑھنے کے قابل ہو سکتے ہیں جو لوگ ابتدائی تعلیم کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵؍ غیر مجلد ۴؍

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے- اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے:-

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سرورق و تصاویر رپن پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے		علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں ۵۰ نسخے	}	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے		

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں . . . . ۵ نسخے	
محصول ڈاک بذمہ خریدار	

۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے	}	کرایہ ریل بذمہ خریدار
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے		
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے		

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے